مغرب اور اسلام

جلد ۶، شمارہ ۴، اکتوبر - دسمبر ۲۰۰۲ء

جہاد، دہشت گردی اور مغربی اندیشے

جہاد، دہشت گردی اور مغربی اندیشے
جہاد، دہشت گردی اور مغربی اندیشے
جہاد، دہشت گردی اور مغربی اندیشے
جہاد، دہشت گردی اور مغربی اندیشے
جہاد، دہشت گردی اور مغربی اندیشے



انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز

کی کتب اور رسائل

افغانستان: جارحیت، جہاد، بحران

مصنف: مختار حسن (مرحوم)

صفحات ۶۴۱ قیمت مجلد ۲۸۰ روپے ڈالر ۱۶

کریملن کابل اور افغان

مصنف: مختار حسن (مرحوم)

صفحات: ۱۷۳ قیمت مجلد ۱۲۰ روپے ڈالر ۸

رسائل

۱- پاکستان پولیٹیکل پریسپکٹو (ماہانہ)

سالانہ زرتعاون ۴۸۰ روپے فی کاپی ۴۵ روپے

۲- مغرب اور اسلام (سہ ماہی)

سالانہ زرتعاون ۱۵۰ روپے فی کاپی ۴۰ روپے

۳- نقطہ نظر (ششماہی)

سالانہ زرتعاون ۱۰۰ روپے فی کاپی ۶۰ روپے

'odern Islamic Polity The Making

uthor: Dr Murad Wilfried Hofman

'ages 71 Price Rs.100 6$

'conomic: An Islamic Approach

uthor: Dr Muhammad Nejatullah Siddique

ages 99 Price Rs. 150 8$

xperiences in Islamic Banking

Case Study of Islamic Bank Bangladesh

ages 87 Price Rs. 120 7$

'owards Islamic Banking

xperiences and Challanges

Case Study of Pilgrims Management

Fund Board Malaysia

'ages 111 Price Rs. 150. 8$

'uclear Deterrence

'TBT and Pakistan

n IPS Study Group Report

'ages149 Price Rs180 10$

تقسیم کنندہ: بک ٹریڈرز، بلاک 19، نصر چیمبرز، مرکز ایف سیون - اسلام آباد فون 0194

سہ ماہی

مغرب اور اسلام اسلام آباد

جلد ۶، شمارہ ۴، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۲ء

مغرب اور اسلام میں شائع ہونے والے منتخب مضامین کے تراجم و خلاصے بلا تبصرہ اور اطلاعاً پیش کیے جاتے ہیں جن کے مندرجات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

زرِ تعاون : (اندرونِ ملک) فی پرچہ ۶۰ روپے، سالانہ ۲۰۰ روپے (بذریعہ عام ڈاک)

سالانہ ۳۰۰ روپے (بذریعہ کوریئر)

(بیرونِ ملک) فی پرچہ ۳ امریکی ڈالر، سالانہ ۱۰ ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

زیرِ اہتمام : انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، بلاک ۱۹، مرکز ایف سیون، اسلام آباد، فون: ۳-۲۶۵۰۹۷۱

فیکس: ۲۶۵۰۷۰۴، ای میل: ips@ips.net.pk

ویب سائٹ: www.ips.org.pk

طابع : کرسٹل پرنٹرز - اسلام آباد

''دہشت گردی'' اور مسلمان

انیس احمد

مشہور امریکی ماہر لسانیات نوام چومسکی (Noam Chomsky) نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں انگریزی میں "War on Terror" کی اصطلاح کو لسانی نقطہ نظر سے منطقی طور پر ناممکن قرار دیتے ہوئے امریکہ کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کیے کہ "The US is one of the leading terrorist states in the world"[1]۔ اس سے جہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امریکی باشندوں کی ایک بڑی تعداد امریکی حکومت کی تشدد پسند پالیسیوں کی حمایت نہیں کرتی اور خصوصاً جو لوگ پڑھے لکھے اور دانشور ہیں وہاں یہ بات بھی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ حق گوئی اور اس کے لیے نتائج سے بے پرواہو کر آواز بلند کرنے کی روایت آج بھی پائی جاتی ہے۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے سانحے کو دہشت گردی قرار دینے کے باوجود یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ مغربی ممالک خصوصاً امریکہ نے گزشتہ ۲۰ سال کے عرصے میں جو دہشت گردی سمندر پار ممالک میں پھیلائی ہے اس کی مثال پوری گزشتہ صدی میں نہیں ملتی۔ چومسکی کا کہنا ہے کہ گو امریکہ نے وسطی امریکہ میں تباہی پھیلائی اور جنوبی افریقہ میں لاکھوں افراد کے قتل کا باعث بنا لیکن ۱۱ ستمبر کے واقعے نے امریکہ اور یورپی ممالک کو عالمی سطح پر دہشت گردی کا عذر فراہم کر دیا۔ چومسکی کا یہ بھی کہنا ہے کہ جو حضرات اس وقت امریکی انتظامیہ کی ناک کا بال ہیں وہ عالمی عدالت کی نگاہ میں بذات خود دہشت گردی کے ملزم ہیں۔

لیکن کیا امریکہ کو دہشت گرد قرار دے کر مسئلہ کا حل کیا جا سکتا ہے یا امریکی سرمایہ داری اور عالمی جارحیت کے علاقائی اداروں ''عالمی تجارتی مرکز'' یا ''جڑواں میناروں'' کو نشانہ بنا کر امریکی سامراجیت کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے؟ مزید یہ کہ آخر دہشت گردی ہے کیا؟ اگر ایک قوم اپنے حقوق انسانی کے حصول کے

1. Noam Chomsky, "United States is a leading Terrorist State," *The Daily Times*, Jan 1, 2003.

لیے کسی جابر و ظالم اور تشدد پرست حکومت کے خلاف تحریک چلاتی ہے تو کیا اس تحریک حریت کو دہشت گردی قرار دیا جائے گا؟ کیا ابراہیم لنکن اور جارج واشنگٹن جیسے امریکی ہیرو اور نیلسن منڈیلا جیسے افریقی رہنما اپنے اپنے دور میں دہشت گردی کی جنگ لڑ رہے تھے یا وہ جہاد حریت میں مشغول تھے؟ کیا تشدد اور دہشت گردی صرف فلسطین اور کشمیر میں پائی جاتی ہے اور اس بنا پر ہر گمنام فلسطینی اور کشمیری اصلاً ایک دہشت گرد اور دنیا کے امن کے لیے بارودی فلیتہ ہے؟ کیا تحریکات حریت میں بعض اوقات بارودی پٹی کے ذریعہ خودکش حملہ کرنے والے افراد جو جان قربان کرتے ہیں یا خودکشی کے مرتکب ہوتے ان کا وجود صرف اسلامی روایت میں پایا جاتا ہے اور صرف مسلمان ہی ظلم اور استحصال کے خلاف جہاد کرنا فرض سمجھتے ہیں یا دیگر مذاہب میں بھی اس قسم کے تصورات پائے جاتے ہیں؟ ۷۰-۶۵ میلادی میں یہودیوں کا فرقہ، جو Zealosts کے نام سے مشہور ہے، رومن فرمانرواؤں کے سامنے خود کو رضا کارانہ طور پر قربانی کے لیے پیش کرتا تھا۔ کیا وہ بھی کشمیری یا فلسطینی نژاد تھے یا عارفانہ طور پر دل سے مسلمان ہو کر عیسائیت کی صلیب ہاتھ میں لے کر یہ نیک کام کر رہے تھے؟

کیا بابری مسجد کے ڈھانے والے ہاتھ اور گجرات میں بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو بلا امتیاز قتل کرنے، ان کے مکانات کو جلانے اور بہت سوں کو زندہ نذر آتش کرنے والے ''اہمسا'' کے بچارے تھے یا ہندستان کی برسر اقتدار جماعت بی جے پی اور وشوا ہندو پریشد کے ''ہندوتوا'' فلسفہ پر عامل سفاک قاتل اور مجرم تھے؟ یہ اور اس نوعیت کے بہت سے سوالات حالات حاضرہ کے ایک طالب علم کو یہ سوچنے پر ابھارتے ہیں کہ کیا وجہ ہے ہر ٹی وی کی سرخیوں میں جو مناظر آتش زدگی، قتل، بربریت کے دکھائے جاتے ہیں ان کرداروں کی وضع قطع اور لباس مسلمانوں کا سا ہی کیوں ہوتا ہے؟ ہر نظر آنے والے ستون کے پیچھے ایک اسامہ بن لادن ہی کیوں چھپا نظر آتا ہے؟ کیا یہ ابلاغ عامہ کی کسی عالمگیر سازش کی بنا پر ہے یا فی الواقع ہر گڑ بڑ کی ذمہ داری کبھی سامنے نہ آنے والے سات پردوں میں روپوش، ''اسامہ بن لادن'' پر ہی عائد ہوتی ہے؟

اس مختصر جائزہ میں ان سب سوالات کا، بغیر کسی معذرت کے، حقیقت پسندانہ مفصل اور معروضی جواب صفحات کی قلت کے سبب دینا بہت مشکل ہے اس لیے ہم محض چند نکات پر ہی اکتفا کریں گے۔ جہاں

تک دہشت گردی کی تعریف کا سوال ہے اقوام متحدہ میں ''غیر جانبدار گروہ'' اس کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:

"Acts of violence commited by a group of individuals which: endanger human lives and jeopardize fundamental freedom, the effects of which are not confined to one state. This should not however effect the inalienable rights to self-determination under colonial and racial regemes"[1]

گویا کشمیر ہو یا فلسطین اور ماضی کا جنوبی افریقہ ہو یا الجزائر جہاں کہیں بھی بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف کوئی تحریک برپا ہوئی وہ نہ دہشت گردی تھی نہ کوئی جرم۔

پھر کیا وجہ ہے کہ کسی بھی عالمی حادثہ کے وقوعہ کے فوراً بعد قیاس کے گھوڑوں کا رخ مسلمانوں کی طرف ہوتا ہے اور ممکنہ ملزم کے عیسائی نام کے ساتھ مسلم ناموں کے اجزاء شامل کر دیے جاتے ہیں؟ ہمارے خیال میں اس کے تین بنیادی اسباب ہیں۔ اولاً بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ ۳۰ سال میں عالمی طور پر اسلامی احیائی تحریکات کے اثرات کو محسوس کرتے ہوئے مغربی سرمایہ داری، قبل اس کے کہ ان تحریکات کے زیر اثر متوقع نتائج نکلنے شروع ہوں، ابلاغی اور عسکری قوت کا بے دریغ استعمال کر کے ان تحریکات کو غیر مؤثر بنانے ہی میں اپنی نجات اور بقا سمجھتی ہے۔ اس لیے جہاں کہیں ایسے امکانات پیدا ہونے شروع ہوئے، مثلاً جب الجزائر میں جمہوری عمل کے ذریعہ اسلامی احیائی تحریک کے سیاسی اقتدار میں آنے کی شکل بنی تو عسکری قوت استعمال کر کے اس جمہوری عمل کا اسقاط کر دیا گیا نتیجتاً ایک طویل مزاحمتی تحریک شروع ہوگئی جو ایک دہائی گزرنے پر بھی برقرار ہے۔

ثانیاً بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دہشت گردی کا عذر گھڑنے کے بعد مغربی سرمایہ دارانہ قوتیں ان قدرتی وسائل پر دوبارہ مکمل اختیار حاصل کرنا چاہتی ہیں جو بیسوی صدی کی تحریک حریت کے نتیجے میں اس کے سیاسی تسلط سے آزاد ہو گئے تھے۔ چنانچہ عراق کے تیل کے ذخائر ہوں یا سعودی عرب اور ایران کے، ان پر قبضہ کرنے کی حکمت عملی یہ طے پائی ہے کہ پہلے ان تمام ممالک کو بنیاد پرست، امن دشمن اور حقوق انسانی کی پامالی کا ملزم قرار دے کر عالمی سطح پر ان کی تصویر کشی ترقی کے دشمن اور عالمی دہشت گردی کے

1. Proceedings of the 28th session of the General Assembly/A/9028/ 1973). quoted by Khurshid Ahmad, in Forward to *Terrorism Myth and reality*, by M.A. Zaki, I.P.S. Islamabad, 2002, P. 8.

پشت پناہ کی حیثیت سے کی جائے تا کہ ان پر ہاتھ صاف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ ہو چنانچہ گزشتہ چند ماہ سے سعودی عرب کی وہابیت، ایران کی ''کربلائی'' تشدد پرستی اور پاکستان میں ''مذہبی جنونیوں'' کا ہوا بار بار اخبارات اور ٹی وی کی سرخی بنایا جا رہا ہے تا کہ ان میں سے کسی بھی ملک پر یلغار کرنے کا جواز پیدا کر لیا جائے۔ ماضی کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ عراق کو ایران کے خلاف ہر قسم کی امداد دینے کے بعد اس کے خلاف استعمال کیا گیا اور جب وہ یہ کام اطاعت گزاری کے ساتھ کر چکا تو اس کو کویت کے خلاف کارروائی کی اجازت مرحمت فرما دی گئی اور پھر اسے کیمیاوی گیسوں کے ذریعے کردوں کو نشانہ بنانے میں امداد فراہم کرنے کے بعد اچانک امن عالم کے لیے خطرہ قرار دے دیا گیا اور اس بات کو اتنی مرتبہ دہرایا گیا کہ عراقیوں کو بھی اپنے دہشت گرد ہونے کا گمان ہو جائے۔

اس بازیگری کا حاصل؟ کویت سعودی عرب اور قطر میں ان ممالک کے مفادات کے تحفظ کے لیے امریکی افواج کی موجودگی کا جواز پیدا کرنا اور پھر ان مسلم ممالک کو انہی کے پڑوسی ملک سے محفوظ کرنے کے لیے پڑوسی ملک (عراق) کے تیل کے ذخائر کو اپنی تحویل میں لانا نظر آتا ہے۔ اس کارروائی کا منطقی تسلسل یہ معلوم ہوتا ہے کہ عراقی ''دہشت گردی'' کے خاتمہ کے بعد ایرانی ''دہشت گردی'' اور پھر پاکستانی ''دہشت گردی'' کو مٹانے کے لیے ''انسانیت کی خدمت'' کے اعلیٰ اور زرین اصول پر عمل کرتے ہوئے امریکہ اپنا یہ ''اخلاقی'' فرض پورا کرنے پر مجبور ہوگا۔

ثالثاً مغربی سرمایہ داری کے راسخ العقیدہ نمائندے اور دانشور تشدد اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کو ایک ایسی تہذیبی اور ثقافتی جنگ قرار دے رہے ہیں جس کا مقصد بظاہر مغربی سرمایہ داری اور جدیدیت کا تحفظ ہے۔ چنانچہ علمی پیرائے میں یہ بات کہی جا رہی ہے کہ "Radical Islamists, intolerent of all diversity and dissent, have become the fascists of our day. That is what we are fighting against".[1]

کہا جا رہا ہے کہ اسلام بذاتِ خود ایک ایسا دین ہے جو جدیدیت کا دشمن ہے، اختلاف رائے کو برداشت نہیں کرتا، انتہا پسندی کا مظہر ہے اور جہاد کے نام پر ''مذہبی جنونیوں'' کی نسل پیدا کرتا ہے۔ یہ

1.Francis Fukuyama, "Their Target: the Modern World," *Newsweek*, Special Issue 2002, P. 54.

ٹکنالوجی اور سائنسی ترقی کو گناہ سمجھتا ہے۔ اس کے عقائد ونظریات کو نظر ثانی اور نئی تعبیر کی سخت ضرورت ہے تا کہ دورِ جدید کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔ اسلام کی تعلیمات میں رواداری، جمہوریت، اباحیت اور لادینیت کو شامل کر لیا جائے تو شاید اسلام ایک ایسا بے ضرر دین بن جائے جو مغرب کے لیے قابل قبول ہو اور مغربی معاشی ترقی کے لیے مشکلات اور خطرات کا باعث نہ بنے۔ مسلم دنیا کے لیے قابل تقلید مثال اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ جنوبی کوریا، جاپان اور ترکی کی ہے جنھوں نے مغربیت کو بلا روک ٹوک اختیار کیا اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ اسلام میں چونکہ آزادی رائے کے لیے کوئی مقام نہیں ہے (گویا اسلام ان کی نگاہ میں پاپائیت ہی کی ایک شکل ہے) اس لیے بادشاہتیں اور آمریتیں ہی ان کا مقدر بن گئی ہیں۔ گویا مراکش ہو یا اردن، ترکی کی فوجی قیادت ہو یا الجزائر کے فوجی حکمران، سابقہ شاہ ایران کی حکومت ہو یا عراق کے صدام حسین ان سب کو ان کے ''راسخ العقیدہ مسلمان'' ہونے کی بناء پر ان ممالک کے عوام نے اپنے سروں پر مسلط کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے ناجائز طور پر برسرِ اقتدار آنے میں امریکہ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

مغربی محققین واضح تاریخی حقائق کا دیدہ دلیری سے مذاق اڑاتے ہوئے خود قرآن کریم کے حوالے سے وہ بہت سی باتیں دوبارہ اٹھا رہے ہیں جو صدیوں سے زیرِ بحث آتی رہی ہیں اور جن پر مسلم علماء اور دانشوروں نے علمی سطح پر بغیر کسی معذرت کے حقائق کو بلا کم وکاست پہلے ہی پیش کر دیا ہے۔

بعض مغربی ناقدین قرآن کریم کی ان آیات کے حوالے سے جن میں جہاد اور قتال کا حکم دیا گیا ہے یہ کہتے ہیں کہ ایسی آیات کی موجودگی میں، جو ان کے بقول ان آیات کو منسوخ کر دیتی ہیں جن میں امن ترقی اور محبت کا پیغام دیا گیا ہے، اسلام کو کس طرح ایک امن پسند مذہب کہا جا سکتا ہے۔ سورہ النساء کی آیت ۷۴ کو اس کے سیاق وسباق سے نکال کر بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے کہ ''اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں۔ پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے'' (النساء ۴: ۷۴)۔

اس آیت مبارکہ کو نقل کرنے کے بعد مغربی مستشرق یہ کہتے ہیں کہ اسلام لوگوں کو لڑائی اور قتل پر

ابھارتا ہے۔ کاش یہی مستشرق اس آیت سے اگلی آیت کو بھی پڑھ لیتے اور پھر دونوں آیتوں کو ملا کر ان کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے۔ رب کریم اگلی آیت میں فرماتا ہے'' آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی مددگار پیدا کر دے (النساء۴: ۷۵)۔ اس آیت کو اگر صرف ایک غیر جانبدار نظر ڈال کر پڑھ لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ پہلی آیت کس کے خلاف جنگ پر ابھارتی ہے؟ اگر ظلم، تشدد، حقوق انسانی کی پامالی کرنے والے سفاک افراد کو ان کے حال پر یہ کہہ کر چھوڑ دیا جائے کہ ہم تو امن کے پرستار ہیں، ہم تلوار کو ہاتھ لگا کر گناہ کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتے تو کیا یہ رویہ اخلاق کے کسی بھی پیمانہ پر پورا اترے گا؟

اسلام اور قرآن کو کوئی معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اگر جہاد کی بات کرتا ہے تو دوٹوک، سیدھے اور غیر مبہم انداز میں یہ بات کہتا ہے کہ ہر ظالم، جابر، سفاک کے خلاف جنگ کرنا انسانی فریضہ ہے۔ اسلام کا مقصد قیام امن و عدل ہے اور اس میں اگر گفت وشنید، اخلاقی دباؤ، ترغیب و مکالمہ ہر چیز ناکام ہو جائے اور عورتیں، بچے اور بوڑھے مسلسل ظلم کا شکار ہو رہے ہوں تو پھر اس سے قطع نظر کہ وہ مظلوم مسلمان ہیں یا غیر مسلم، ان کی نصرت و امداد مسلمان پر فرض ہو جاتی ہے۔ یہی وہ پیغام ہے جو یہ دو آیتیں دیتی ہیں ان میں کس جگہ یہ کہا گیا ہے کہ بلا کسی سبب کے جب اور جہاں چاہو مذہب کے نام پر خون بہا دو؟

اسی طرح سورہ توبہ کی ایک آیت کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس میں غیر مسلموں اور اہل کتاب کے خلاف قتل عام کی اجازت دی گئی: '' جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور زیر نگین بن کر رہیں'' (التوبہ۹: ۲۹)۔ یہاں بھی قرآن کریم یہ بات واضح الفاظ میں بیان کر رہا ہے کہ غیر مسلم اہل کتاب ہوں یا کوئی اور ان کے خلاف صرف اس وقت تک جنگ کی جا سکتی ہے جب تک وہ اسلامی ریاست کی سیادت تسلیم نہ کر لیں۔ اصل مقصد ان کو قتل کرنا، ختم کرنا، تباہ کرنا نہیں ہے بلکہ قانون کی حکمرانی ہے، امن و عدل کا

قیام ہے۔ جہاد کا مدعا انہیں مار مار کر قوت کے زور سے مسلمان بنانا یا صفحہ ہستی سے مٹانا نہیں ہے۔ اسلام کسی بھی ذی روح بلکہ غیر ذی روح کو بھی تشدد کے ذریعہ تباہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ حیوان ہوں یا نباتات یہ صرف مغربی سامراجی طاقتوں کا طریقہ ہے کہ وہ جہاں چاہیں ''توڑا بورا'' کرنے کا پیدائشی حق بزعم خود استعمال کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتے۔ وہ ویت نام ہو، کوریا ہو، بوسنیا ہرزیگوینا ہو، چیچنیا ہو، آذر بائیجان ہو، افغانستان ہو یا عراق وہ جب اور جہاں چاہتے ہیں اپنے مفاد کے لیے دوسروں کو ظلم و بربریت کا نشانہ بنانا اپنا ''انسانی فرض'' سمجھتے ہیں۔

سورہ المائدہ کی آیت ۵۱ کے حوالے سے بھی یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ یہود اور عیسائیوں کو ''دشمن'' کے مقام پر رکھ دیتی ہے اور اس طرح ان کے خلاف نفرت کے جذبات کو ہوا دیتی ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ یہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی انہیں میں ہے یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے'' (المائدہ ۵:۵۱)۔ سلسلہ مضامین پر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ آیت نمبر ۴۲ سے جس موضوع پر بات کی جا رہی ہے وہ اہل کتاب کا عناد، جھوٹ اور دھوکہ دہی پر مبنی طرز عمل ہے جس میں ان کے مذہبی رہنماؤں کا اپنے ذاتی مفاد کے لیے توراۃ و انجیل کی تعلیمات کو بدل دینا اور اللہ کے ساتھ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ کو شریک بنانا ہے۔

پھر بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو شریعتیں مختلف ادوار میں نازل کی ہیں ان میں بہت سی تعلیمات مشترک ہیں۔ اسلامی شریعت بھی انہی اصولوں پر مبنی اور من جانب اللہ ہے اس لیے یہود و نصاریٰ کے بہکائے میں آئے بغیر فیصلے اللہ کی شریعت کے مطابق کیے جائیں، باوجود اس کے کہ یہود و نصاریٰ کی کوشش یہ ہو کہ اہل ایمان کو فتنہ میں ڈال کر اپنی طرح گمراہ کر دیں۔

اس تفصیل کے بعد جو آیت ۴۲ سے آیت ۵۰ تک بیان کی گئی ہے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ یہود اور عیسائیوں کو رفیق نہ بنایا جائے کیونکہ یہ تو آپس ہی میں گمراہوں کے رفیق ہو سکتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو سیاق و سباق کی روشنی میں اس سے زیادہ سچی بات اور کیا ہو سکتی ہے جو یہاں کہی جا رہی ہے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جس سورۃ کے حوالے سے مستشرقین یہ الزام اسلام کو دیتے ہیں، اس کا آغاز جن

الفاظ سے کیا جا رہا ہے وہ ان محققین کی نگہ انتخاب سے نہ جانے کیوں اوجھل ہو جاتے ہیں۔ فرمایا جا رہا ہے: ''آج تمہارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لیے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی [یہودی یا عیسائی] بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ بنو---'' (المائدہ ۵:۵)۔

ایک معمولی عقل کا انسان بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ جن یہودی یا عیسائی نیک خواتین کے ساتھ رشتہ مناکحت کی اجازت دی جا رہی ہو گویا انہیں اپنے گھر اور اپنے معاشرہ میں ایک قابل احترام بیوی کا مقام دیا جا رہا ہو اور جن کے ساتھ کھانے پینے کے معاشرتی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دی جا رہی ہو، ان کے بارے میں کیا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ تمہارے دشمن ہیں جہاں کہیں مل جائیں انہیں تہ تیغ کر دو، تہس نہس کر دو اور صفحہ ہستی سے مٹا دو!

دوسری جانب کیا قرآن کریم کو یہ چاہیے کہ جو یہودی اور عیسائی بظاہر دوست بن کر آئیں جبکہ ان کا واضح مقصد فتنہ و فساد ہو، اہل ایمان کو آپس میں لڑانا ہو، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت کے بہانے بلا کر زہر بھرا گوشت کھلا کر قتل کرنے کی نیت ہو تو کیا قرآن یا توراۃ کو ایسے افراد کو جگری دوست بنانے کا مشورہ دینا چاہیے؟ قرآن کریم ہی نہیں کسی بھی کتاب سے ایک جملہ نکال کر اس کو اپنے من مانے معنی پہنانا نہ تو فکری دیانت ہے اور نہ اس کتاب کے ساتھ انصاف۔ اسی لیے قرآن کریم نے یہ کہا تھا کہ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو یہ تقویٰ کی روش سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے'' (المائدہ ۵:۸)۔

ایک اور قرآنی آیت: ''پس جب ان کافروں سے تمہاری مڈھ بھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو اس کے بعد (تمہیں اختیار ہے) احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کر لو تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے'' (سورہ محمد ۴۷:۴)۔ مغربی مستشرق اس آیت کی یہ تعبیر کرتے ہیں کہ قرآن یہ چاہتا ہے کہ اہل ایمان کو جہاں کہیں کفار مل جائیں ان کی گردنیں

مارتے چلے جائیں اور کشتے کے پشتے لگا دیں، بالکل اسی طرح جیسے کہ بوسنیا ہرزیگوینا میں بہت سے مقامات پر اجتماعی قبروں کی دریافت سے معلوم ہوا کہ کروٹ اور سرب عیسائیوں نے مسلمانوں کو بلاتفریق جنس وعمر تہ تیغ کیا۔

اس آیت مبارکہ کے نزول سے قبل سورہ الحج کی آیت ۳۹ اور سورہ البقرہ کی آیت ۱۹۰ جہاد کی اجازت کے سلسلہ میں آ چکی تھیں۔ اب اس بات کی ضرورت تھی کہ اسلامی قانون جنگ کی وضاحت جنگ پیش آنے سے قبل ہی کر دی جائے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ اگر مشرکین و کفار کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی تحریک کو دبانے اور مٹانے کے لیے تمہیں مدینہ سے بے دخل کرنے کے لیے پوری قوت سے مدینہ پر حملہ آور ہو کر اس دعوت حق کی روشنی کو بجھا دیں تو جہاد کی اجازت کی روشنی میں تم بھی ان کی قوت توڑنے میں تکلف نہ کرو ''گردنیں مارنا'' محض قتل کرنے کے معنی میں نہیں بلکہ واضح طور پر ان کی قوت توڑنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

کسی بھی جنگ کی حکمت عملی یہی ہوتی ہے کہ مخالف کی قوت کو توڑا جائے۔ اس لیے قرآن کا یہ کہنا اخلاق وعدل کے اصولوں پر مبنی صحیح ترین عمل نظر آتا ہے۔ ہاں اگلی بات یہ سمجھا دی گئی کہ مقصود ان کا بے رحمانہ قتل نہیں بلکہ اگر ان کی قوت ٹوٹ جائے تو انہیں قید میں آنے کے بعد قتل نہیں کیا جا سکتا، ہر قیدی کو عزت واحترام کے ساتھ لباس، کھانا، تحفظ دیا جائے گا اور اس کے سامنے یہ اختیار ہو گا کہ وہ اپنے آپ کو فدیہ دے کر آزاد کرا لے یا اسلامی ریاست اسیر پر احسان کر کے رہا کر دے یا تبادلہ اسیران میں اسے رہا کر دیا جائے۔ ہمارے علم میں کسی انتہائی ''پرامن'' فلسفہ پر مبنی مذہب یا قوم کا کوئی ایسا اصول نہیں جس میں کہا گیا ہو کہ جب دشمن تم پر حملہ آور ہو تو اپنے دروازے کھول کر سر جھکا کر ادب سے اس کا استقبال کرتے ہوئے اپنی گردنیں قلم کرانے کے لیے پیش کر دو اور یقین کر لو کہ تمہاری طرف سے ایک انگلی بھی نہ اٹھے، نہ اس میں سے ایک قطرہ خون ٹپکے!

مستشرقین کے بعض اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ کاش یہ علم کے مدعی بات کرنے سے قبل حصول معلومات بھی کر لیتے۔ مثلاً یہ کہنا کہ مسلم apologists یہ کہتے ہیں کہ تمام غلط فہمی اس بنا پر پیدا ہوتی ہے کہ قرآن کریم کے انگریزی تراجم ناقص ہیں اس بنا پر جہاد اور قتال کے

بارے میں غلط تصورات پائے جاتے ہیں (الراوندی: "Islam and Armageddon")۔ یہ نصف سچائی پر مبنی ایک بیان ہے۔ ہمارے خیال میں بعض صورتوں میں اس کا امکان تو ہے لیکن اصل مسئلہ ترجمہ کا نہیں بلکہ قرآن کریم کی آیات کو سیاق وسباق سے الگ کر کے اس کا مفہوم اپنے ذہنی مفروضوں کی روشنی میں متعین کرنا ہے۔

تحقیق کا بنیادی اصول ہے کہ زیر بحث معاملہ کو براہ راست اس کے سیاق وسباق میں دیکھا جائے اس کے بعد کوئی رائے قائم کی جائے یہی سبب ہے کہ مستشرقین بعض ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو بنیادی اسلامی علمی اصطلاحات سے ان کی ناواقفیت کا اظہار کرتی ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ مکی آیات رحم وعفو ومحبت سے بھری ہوئی ہیں جبکہ مدنی آیات مثلاً مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو" نے ۱۲۴ ایسی آیات کو جو رحم ولطف سے متعلق تھیں منسوخ کر دیا ہے (الراوندی، ایضاً)، نہ صرف مکی ومدنی آیات سے ناواقفیت ظاہر کرتا ہے بلکہ نسخ فی القرآن جیسے اہم مضمون سے مکمل لاعلمی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

حقیقت واقعہ یوں ہے کہ ۹ ہجری میں جب مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کی قیادت میں پہلا حج کیا تو سورہ توبہ کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں اللہ اور اس کے رسول نے ان مشرکین سے اپنی برأت کا اعلان کیا جن سے اس سے قبل بعض معاہدے ہوئے تھے اور وہ ان کی خلاف ورزی کرتے رہے تھے۔ انہیں مہلت دی گئی کہ وہ آئندہ چار ماہ تک اپنے بارے میں طے کر لیں اور اگر کہیں اور جا کر آباد ہونا ہو تو بلا روک ٹوک چلے جائیں یا اپنی روش بدلنی ہو تو ایسا کر لیں۔ اس کے بعد ان کے خلاف عام اعلان جنگ کرتے ہوئے یہ بات سمجھا دی گئی کہ ان چار ماہ کے بعد مشرکین کے خلاف اس وقت تک جنگ ہوگی جب تک وہ اپنی غلطی کا اعتراف (توبہ) کرنے کے بعد نماز اور زکوۃ پر عامل نہ ہو جائیں۔

چنانچہ اس آیت سے اگلی آیت میں مشرکین کے حوالے ہی سے یہ ہدایت کی گئی کہ گو ان کے خلاف جارحیت کی اجازت ہے لیکن اگر کوئی مشرک عین حالت جنگ میں بھی اہل ایمان سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دی جائے اور اسے قرآن سننے اور اہل قرآن کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ پھر اسے مجبور کیے بغیر اور اس پر کسی قسم کا تشدد کیے بغیر اس کے گھر تک اپنی امان اور حفاظت میں پہنچانا مسلمانوں کا فرض ہے۔ چنانچہ فرمایا: "اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ کلام الٰہی سنے)

تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ کلام الٰہی سن لے پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اس لیے کرنا چاہیے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے'' (التوبہ ۹:۶)۔

دونوں آیات کو ملا کر پڑھیے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ''مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ'' کے حکم کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ یہ ایک مطلق اجازت نہیں ہے کہ جہاں کسی مشرک کو دیکھا اور نشانہ بنا دیا بلکہ اس بات کا اعلان ہے کہ ہماری اصل جنگ شرک و کفر کے ساتھ ہے اگر کوئی مشرک حصول معلومات کے لیے اہل ایمان سے پناہ طلب کرتا ہے تو قرآنی حکم کی اطاعت میں اسے نہ ہاتھ لگایا جائے گا نہ قیدی بنایا جائے گا بلکہ اپنی حفاظت میں اسے اس کے گھر تک لے جایا جائے گا۔ یہاں بھی آیت کے ایک حصے کو سیاق و سباق سے الگ کرنے کے نتیجے میں مستشرقین ایک گمراہ کن تعبیر کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے خود قرآن سے فلسفہ تشدد کو ثابت کر دیا۔

ہمیں سیموئیل ہنٹنگٹن Samuel Huntington کے اس مفروضہ سے بنیادی اختلاف ہے کہ جڑواں میناروں پر حملہ ''مسلم جنگوں'' کے دور کا حصہ ہے۔ وہ سیاست و تاریخ کے ایک پروفیسر کی حیثیت سے یہ بات کہتے ہیں کہ ان جنگوں کا آغاز ۱۹۸۰ء میں عراق کے ایران پر حملے سے ہوا۔ ۱۹۸۹ء میں ان کے نتیجے میں دس سال کی جدوجہد کے بعد سابقہ سویت یونین کو افغانستان سے نکلنا پڑا۔ ۱۹۹۰ء میں عراق کا کویت پر حملہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی اور پھر ۱۹۹۳ء میں پہلی مرتبہ عالمی تجارتی مرکز پر حملہ ''مسلم جنگوں'' ہی کا حصہ تھا۔ یہاں شاید یہ بات وہ نامعلوم وجوہات کی بناء پر نظر انداز کر جاتے ہیں کہ کیا عراق کا ایران پر حملہ یا کویت پر حملہ ایک ''مسلم جنگ'' تھا یا امریکہ کی سرپرستی اور ترغیب اور یورپ کی جانب سے صدام حسین کو اسلحہ فراہم کرنے اور امریکہ کی طرف سے اس یقین دہانی کی بنا پر تھا کہ وہ اس معاملہ کو ایک ''مقامی تنازعہ'' سمجھے گا۔ گویا یہ امریکہ کی جانب سے عراق کو اکسا کر ایران کی طاقت کو توڑنے کی ایک قبیح حرکت تھی جسے محترم ہنٹنگٹن ''مسلم جنگ'' سے تعبیر کر رہے ہیں۔ کیا افغان جہاد صرف اور صرف ''مسلم جنگ'' تھا یا امریکہ کی عسکری، سیاسی، اخلاقی حمایت کا اصل محرک و مقصد افغانستان کے ذریعہ سویت یونین کو سبق سکھانے کی خواہش تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس جہاد نے امت مسلمہ کے لیے کچھ اور ہی کردار ادا کیا لیکن اس کا محرک اور پشت پناہ کیا ''القاعدہ'' تھا یا پنٹا گون اور سیاہ باطن والا ''سفید گھر''؟

ہمیں مغربی نقادوں کی اس رائے سے بھی مکمل اختلاف ہے کہ مسلم دنیا کے خلاف امریکہ اور بعض یورپی ممالک کی موجودہ جنگ تشدد کے خلاف ہے۔ واقعات نے یہ بات عیاں کر دی ہے کہ اس کا اصل ہدف وہ معدنی ذخائر ہیں جن پر امریکہ اور بعض یورپی اقوام دوبارہ مکمل تصرف و قبضہ کر کے اپنے معاشی مستقبل کو یقینی بنانا چاہتے ہیں۔ اس غرض کے لیے جو حکمت عملی طے کی گئی ہے وہ خفیہ نہیں ہے بلکہ ببانگ دہل یہ بات کہی جا رہی ہے کہ جہاں کہیں ضرورت ہو عسکری کارروائی سے اور جہاں اس کے بغیر کام ہو جائے مسلم ممالک میں ایسے افراد کو برسر اقتدار لایا جائے جو امریکی مفادات ہی کو اپنا مفاد سمجھتے ہوں بصورت دیگر برہنہ قوت کے استعمال سے ان ممالک کو زیر کر کے یک قطبی نظام میں امریکہ کی برتری کو یقینی بنایا جائے۔ اسلامی تحریکات اور تحریکات حریت سے نجات کے لیے انہیں پہلے کسی نہ کسی طرح ایک فرضی دشمن (القاعدہ) کے ساتھ ملوث ظاہر کیا جائے اور پھر انہیں قوت کے استعمال سے دبا دیا جائے۔ برہنہ قوت کا یہ استعمال امریکی سیاسی بازیگروں کی اصطلاح میں امریکہ کی سلامتی کے لیے ضروری ہے اس لیے مباح و حلال بلکہ فرضِ عین ہے۔

چنانچہ تشدد کی ایک نئی تعریف یوں کی جا رہی ہے کہ امریکہ نے گزشتہ تین چار عشروں میں دنیا کے مختلف ممالک و اقوام پر جو دست درازیاں کی ہیں وہ نہ تشدد ہیں نہ حقوق انسانی کی پامالی چنانچہ James Glayr جو Veterons of Foreign Wars نامی ایک امریکی تنظیم کا رکن ہے اپنے ایک مضمون میں ہمیں یہ معاملات فراہم کرتا ہے۔ اس کے بقول اس عرصہ میں امریکہ نے دنیا کے ٦٧ ممالک پر جارحانہ حملے کیے ہیں جن میں چند ممالک یہ ہیں:

کوئے موائی اور مڈسا آئی لینڈ، تائیوان، لاؤس، ویت نام، کیوبا، ڈومینیک ریپبلک، کوریا، کمبوڈیا، تھائی لینڈ، لبنان، آسٹریا، لیبیا، خلیج فارس، صومالیہ، ایکسلواڈور، پانامہ، اور کوسوو وغیرہ[1]۔

شاید امریکہ کی اس دیدہ دلیری پر بزبانِ شاعر یوں کہا جا سکتا ہے کہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

1. James Glayr, "And Just How Many Countries We Attacked", *Online.*, Oct. 15, 2002

مسئلہ کا حل ہماری نگاہ میں اسلام اور مسلمانوں پر الزام تراشی اور قوت کے ذریعہ مسلم دنیا کو زیر کر لینا نہیں ہوسکتا۔ نہ مغرب کی پروردہ سیاسی قوتوں کے ذریعہ مسلم عوام کو دبا کر یا بین الاقوامی اداروں کی مدد سے مسلم دنیا میں نوجوانوں کی آبادی کو گھٹا کر کیا جا سکتا ہے۔ بعض مغربی مستشرقین کا کہنا ہے کہ ۲۰۲۰ء تک ضبط ولادت کی بین الاقوامی کوششوں کے نتیجے میں اور مختلف عنوانات سے نوجوانوں کو بربریت کا نشانہ بنانے کے نتیجہ میں ان کی تعداد میں واضح تبدیلی متوقع ہے اور اس طرح انقلابیت اور جہادی اور حریت پسند تحریکات کی قوت میں خود بخود کمی واقع ہو جائے گی۔

گویا ضبط ولادت کی تحریک کے خفیہ مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس طرح نوجوانوں کے موجودہ تناسب کو متغیر کر کے ''دہشت گرد فورس'' کی عددی قوت میں کمی پیدا کر دی جائے، جو ہمارے نقطہ نظر سے خود ایک دہشت پسندانہ حرکت ہے۔ دہشت گردی صرف گولی یا خنجر سے نہیں ہوتی اس کی بعض شکلیں بظاہر بڑی معصوم معلوم ہوتی ہیں لیکن نتائج کے لحاظ سے گولی کے ذریعہ قتل کرنے سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی عالمی بنک کا ایک ترقی پذیر ملک سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ان سودی قرضوں کی ادائیگی کے لیے، جن کا سود وہ اصل سے زیادہ وصول کر چکا ہو، اپنے قومی اثاثے فروخت کر کے ادائیگی کر دے، معاشی دہشت گردی کی کھلی مثال ہے۔ کسی طاقتور ملک کا ایک ترقی پذیر ملک سے یہ کہنا کہ اگر وہ دوست رہنا چاہتا ہے تو اپنی حاکمیت کو طاق پر رکھ کر اپنی زمین اور فضائیں اس کے حوالے کر دے تاکہ وہ کسی پڑوسی ملک پر بمباری کر کے اپنی قوت کا سکہ جما سکے، بدترین قسم کی سیاسی اور بین الاقوامی دہشت گردی ہے۔ اسی طرح کسی عالمی ابلاغی ادارہ کا دنیا کے دیگر ممالک کو اپنی ثقافت میں رنگنا اور اس کی اچھائی اور برائی کے پیمانوں کو اپنی خواہش کا تابع کر دینا ابلاغی شدت پسندی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

مسئلہ کا اصل حل مسلم دنیا میں ایک عادلانہ، روح جمہوریت کے حامل معاشی طور پر مستحکم اور ثقافتی طور پر اسلامی نظام کا قیام ہے تاکہ اندرونی طور پر امن وعدل کے قیام سے شدت پسندی کی نفسیات کو تبدیل کیا جا سکے۔ اصل حل، جہالت کے خلاف جہاد، معاشی استحصال کے خلاف جہاد، فحاشی کے خلاف جہاد، ظلم و زیادتی کے خلاف جہاد، خواتین اور بچوں کے حقوق کی پامالی کے خلاف جہاد کے ذریعہ آنے والی نسلوں کے ذہن اور روح میں احترام انسانیت جاگزیں کرنا ہے۔

اصل حل چند نوجوانوں کو ''القاعدہ'' سے فرضی تعلق کی بنا پر گرفتار کر کے امریکی ایجنسیوں کے حوالے کر دینے سے نہیں ہوسکتا۔ اب تو نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ نہ صرف پاکستان کے اعلیٰ ترین شہرت یافتہ میڈیکل ڈاکٹروں کو جو اپنی خدمت انسانیت کے لیے مثالی معاشرتی مقام رکھتے ہیں بلکہ پاکستان کی پہچان قرار پانے والے سائنسدانوں کو بھی ''دہشت گردوں'' کے ساتھ منسوب کرنے کی مذموم کوشش کی جارہی ہے تاکہ کل انہیں بھی ''قومی وقار'' کے ساتھ سی آئی اے یا ایف بی آئی کے ''امن پسند'' ''اشراف'' کے حوالے کیا جا سکے۔ اگر بالفرض ایسا کر بھی لیا جائے تو مسئلہ حل نہیں ہوتا، اس کا حل سیاسی اخلاقی اور معاشی میدانوں میں طویل المعیاد ترقی وخود انحصاری ہی سے کیا جاسکتا ہے، یہی اسلام کا مقصود و مطلوب ہے۔

مسلم جنگوں کا دور

سیموئل پی ہنٹنگٹن*
ترجمہ: سید راشد بخاری

عصری عالمی سیاست کا دور دراصل مسلم جنگوں کا دور ہے۔ مسلمان کسی بھی دوسری تہذیب کے افراد سے زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ اور غیر مسلموں کے ساتھ لڑائیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ مسلم جنگوں نے، بین الاقوامی تنازعہ کی اہم ترین شکل میں، سرد جنگ کی جگہ سنبھال لی ہے۔ ان جنگوں میں دہشت گردی کی جنگیں، گوریلا جنگیں، خانہ جنگیاں اور بین الریاستی تنازعات شامل ہیں۔ مسلمانوں میں تشدد کی یہ مثالیں اسلام اور مغرب یا اسلام اور دوسروں کے درمیان، تہذیبوں کے ایک اہم تصادم میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ تاہم ایسا ہونا لازمی نہیں ہے بلکہ زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ تشدد مختلف جگہوں پر بکھرا اور پھیلا ہوا رہے۔

مسلم جنگوں کے اس دور کا آغاز ۱۹۸۰ء میں اس وقت ہوا جب سرد جنگ اپنے اختتام کے قریب تھی۔ اس سال عراق نے ایران پر حملہ کر دیا اور اس جنگ میں کم از کم پانچ لاکھ افراد مارے گئے جبکہ زخمی اور معذور ہونے والوں کی تعداد بھی لاکھوں میں تھی۔ ٹھیک اسی عرصے میں افغانستان پر روسی جارحیت سے شدید ترین افغان مزاحمت پیدا ہوئی جس نے ۱۹۸۹ء تک روسی افواج کو افغانستان سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کامیابی میں امریکی ٹیکنالوجی، سعودی اور امریکی سرمایہ، پاکستانی مدد اور ٹریننگ اور دیگر مسلمان، خاص طور پر عرب، ممالک سے ہزاروں جنگجوؤں [مجاہدین] کی شرکت نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔

پھر ۱۹۹۰ء میں صدام حسین نے کویت پر حملہ کر دیا اور اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ امریکہ نے

*Semuel P. Huntington, "The Age of Muslim Wars", *Newsweek*, Dec. 2001 -Feb.2002, Special Davos Edition, pp.6-13.

اسے شکست دینے کے لیے ایک عالمی اتحاد تشکیل دیا جس میں کئی مسلمان ممالک بھی شامل تھے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں ان مختلف ممالک میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تنازعات پھوٹ پڑے مثلاً بوسنیا، کوسووا، مقدونیا، چیچنیا، آذربائیجان، تاجکستان، کشمیر، بھارت، فلپائن، انڈونیشیا، مشرقِ وسطیٰ، سوڈان اور نائجیریا۔ ان میں سے اکثر تنازعات میں مرکزی شرکت کار افغان جنگ میں لڑنے والے مجاہدین جنگجو تھے اور دنیا بھر کے مختلف ممالک میں مسلم دہشت گرد تنظیموں میں بھی زیادہ تر یہی لوگ شامل ہیں۔

۱۹۹۰ء کے عشرے کے وسط میں دنیا کے کل نسلی تنازعات میں سے تقریباً نصف میں یا تو مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار تھے یا غیر مسلموں کے ساتھ مصروفِ جنگ رہے۔ معروف جریدے ''دی اکنامسٹ'' کی شائع کردہ ایک فہرست کے مطابق ۱۹۸۳ء سے ۲۰۰۰ء کے درمیان ہونے والے بین الاقوامی دہشت گردی کے ۱۶ بڑے واقعات میں سے ۱۱ اور ممکنہ طور پر ۱۲ واقعات کے ذمہ دار مسلمان تھے۔ امریکی محکمہ خارجہ نے جن سات ممالک کو دہشت گردی کے مددگار ممالک قرار دیا ہے ان میں سے پانچ مسلم ممالک ہیں۔ اسی طرح دہشت گردی میں ملوث غیر ملکی تنظیموں میں سے اکثر مسلمان تنظیمیں ہیں، ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۵ء کے دوران جوابی کارروائیوں کے لیے امریکی فوجیں مسلمانوں کے خلاف ۷ فوجی آپریشنوں میں مصروف رہیں۔

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسٹریٹجک اسٹڈیز کے مطابق ۲۰۰۰ء میں ۳۲ فوجی تنازعات جاری تھے جن میں سے دو تہائی میں مسلمان ملوث تھے۔ یاد رہے کہ مسلمان دنیا کی آبادی کا صرف پانچواں حصہ ہیں۔ امریکی انتظامیہ نے ۱۱ ستمبر کے دہشت گردی کے واقعات کو جو ''نئی جنگ'' کا نام دیا ہے درحقیقت یہ کوئی نئی جنگ نہیں ہے۔ یہ دہشت گردی کے ہی گزشتہ واقعات کا تسلسل ہے جن میں مسلمان ملوث ہیں اور جن کی وقوع پزیری میں اضافہ ہوگیا ہے۔

قبل ازیں مسلم دہشت گردی کے واقعات اکا دکا اور مقابلتاً محدود تعداد میں رونما ہوتے تھے۔ ۱۹۸۳ء میں بیروت میں امریکی میرین بیرکس پر حملے میں ۲۹۹ افراد مارے گئے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں پرواز پین ایم ۱۰۳ میں ۲۷۰ افراد اور ۱۹۹۸ء میں افریقہ میں امریکی ایمبیسیوں پر حملے میں ۲۲۴ افراد ہلاک

ہوئے تھے۔ مختلف مسلمان گروہ اور ریاستیں ان واقعات میں ملوث تھیں۔ تاہم ۱۹۹۳ء کے آغاز سے امریکیوں اور امریکی تنصیبات پر جتنے بھی حملے ہوئے وہ سب بظاہر اسامہ بن لادن سے منسوب ہیں۔ ۱۱ ستمبر سے اس کے عالمی دہشت گردی کے ایک بڑے نیٹ ورک کی موجودگی کا انکشاف ہوا، جس کی شاخیں غالباً ۴۰ ممالک میں موجود ہیں اور جن کے پاس اتنی مہارت اور وسائل ہیں کہ وہ اچھی منصوبہ بندی کے ساتھ ایک جیسے تسلسل میں حملے کر سکتے ہیں۔ یہ نیٹ ورک پہلی بار خود امریکہ کے اندر تباہ کن اثرات کے ساتھ ظاہر ہوا۔ ان کے اقدامات کیمیائی اور حیاتیاتی حملوں سے مماثل ہیں جس میں ایٹمی ہتھیاروں کا بھی ایک دوراز کار امکان موجود ہے۔ اس طرح مسلم جنگوں کا دائرہ امریکہ تک وسیع ہو گیا ہے۔

مخصوص جنگوں کی ذمہ داری بلاشبہ کسی ایک پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ سوڈان کی حکومت عیسائیوں کے خلاف جاری جنگ کی ذمہ دار ہے تو اسرائیلی حکومت دوسرے انتفادہ کے جواب میں یہودی بستیوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ مغربی کنارے اور غزہ میں اپنی فوجی موجودگی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ تاہم مجموعی طور پر، مسلم جنگوں کے دور کی وجوہات زیادہ عمومی نوعیت کی ہیں۔ ان میں اسلامی عقیدہ وایمان کی بدیہی فطرت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے جسے اس کے پیروکار عیسائیت کے پیروکاروں کی طرح اپنی خواہشات کے مطابق جنگ یا امن، کسی کا بھی جواز پیدا کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ حالیہ مسلم جنگوں کی وجوہات ساتویں صدی کے مذہبی عقیدہ میں نہیں بلکہ سیاست میں پوشیدہ ہیں۔

اول، گزشتہ چند عشروں میں مسلم اقوام میں سماجی، تہذیبی اور سیاسی سطحوں پر جو چند اہم تبدیلیاں اور ترقیاں ہوئی ہیں ان میں ایک اہم پیش رفت اسلامی شعور اور شناخت کے ساتھ اسلامی تحریکوں کا احیاء ہے۔ یہ اسلامی بیداری زیادہ تر جدیدیت اور عالمگیریت کے ردعمل میں پیدا ہوئی ہے اور کئی لحاظ سے اس کی نوعیت بے حد تعمیری ہے۔ اسلامی تنظیمیں شہروں میں رہنے والے مسلمانوں کی بہبود، سماجی امداد، اخلاقی راہنمائی، صحت اور تعلیم کی سہولیات فراہم کرنے اور بے روزگاری جیسے مسائل سے نمٹنے کے لیے آگے بڑھیں۔ یعنی انہوں نے عوام کو وہ سب خدمات مہیا کرنے کی کوشش کی اکثر مسلم حکومتیں جن کی فراہمی میں ناکام ہو گئی ہیں۔ مزید براں، اکثر مسلم معاشروں میں اسلام پسندوں نے بے حد جابر حکومتوں کے بالمقابل حزب اختلاف کا کردار ادا کیا ہے۔ ایک محدود تعداد میں انتہا پسندوں نے بھی اسلامی احیاء کی

تحریکوں سے ہی جنم لیا ہے جو غیر مسلموں کے خلاف دہشت گردی اور گوریلا جنگوں کے لیے بھرتی فراہم کرتے ہیں۔

دوم، پوری مسلم دنیا خاص طور پر عرب میں، مغرب کی دولت، طاقت اور ثقافت کے خلاف غم وغصہ، رنج، رشک وحسد اور مخاصمت پائی جاتی ہے۔ جزواً ایک طرف یہ بیسویں صدی کے بیشتر حصے میں مسلم دنیا پر مغرب کے غلبے اور استعمار کا نتیجہ ہے، دوسری طرف یہ امریکی پالیسیوں، خصوصاً ۱۹۹۱ء میں عراق پر حملے اور امریکہ اسرائیل کے قریبی تعلقات کے خلاف بھی ایک ردعمل ہے۔ وسیع معنوں میں یہ مسلم عوام کی طرف سے اپنی ہی بدعنوان، غیر موثر اور ظالم و جابر حکومتوں کے خلاف احتجاج بھی ہے جنہیں مغربی حکومتوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔

سوم، مسلم دنیا میں قبائلی، مذہبی، نسلی، سیاسی اور ثقافتی اختلافات بھی آپس میں تنازعات اور تشدد کا باعث بنتے ہیں۔ ان تفرقات سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بھی تشدد فروغ پاتا ہے۔ مختلف مسلم گروہ اور حکومتیں مثلاً سعودی عرب اور ایران اپنے اپنے مخصوص برانڈ کے اسلام کی اشاعت کے لیے بوسنیا سے فلپائن تک غیر مسلموں سے برسر پیکار مسلمان گروہوں کی مدد کرتے ہیں۔ اگر پوری مسلم دنیا پر ایک یا دو ریاستوں کا غلبہ یا حکمرانی ہوتی، جو عثمانی خلافت کے خاتمے کے بعد سے ممکن نہیں ہو سکا ہے، تو (شائد) مسلمانوں کے درمیان، بلکہ اغلباً مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بھی اس قدر تشدد فروغ نہ پاتا۔

چہارم، مسلم معاشروں میں اسلامی احیاء کے ساتھ ساتھ شرح پیدائش بھی بہت زیادہ ہے۔ بنابریں ان معاشروں میں ۱۶ سے ۳۰ سالہ نوجوانوں کی کثرت ہے جس سے اسلامی احیاء کے عمل کو بھی تقویت ملی ہے۔ نوجوانوں کے یہ تعلیم یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ جتھے زیادہ تر بے روزگار ہیں چنانچہ ان میں سے کچھ مغرب کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں، کچھ بنیاد پرست تنظیموں اور سیاسی جماعتوں میں شمولیت اختیار کر لیتے ہیں اور محدود تعداد میں یہ نوجوان مسلم گوریلا گروپوں اور دہشت گردوں کے نیٹ ورک کا حصہ بھی بن جاتے ہیں۔ تمام معاشروں میں نوجوان مرد سب سے زیادہ تشدد پھیلانے کا باعث ہوتے ہیں اور مسلم معاشروں میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

یہ عوامل مسلمانوں میں بڑھتے ہوئے تشدد کی وجوہات میں شامل ہیں۔ آج کا تشدد اپنی نوعیت کے اعتبار سے مقامی، محدود اور بکھرا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ تشدد اسلام اور مغرب کے درمیان، اور ممکنہ طور پر دوسری تہذیبوں کے ساتھ بھی، تہذیبی تصادم کی شکل اختیار کر سکتا ہے؟ یہی واضح طور پر اسامہ بن لادن کا مقصد ہے۔ اس نے امریکہ کے خلاف مقدس جنگ کا اعلان کیا ہے اور مسلمانوں کو ترغیب دی ہے کہ وہ امریکیوں کو بلا لحاظ قتل کریں اور اس جہاد کے لیے اس نے ہر جگہ مسلمانوں کو متحرک کرنے کی بے انتہا کوشش کی۔ اس نے اسلام میں کئی طرح کی تقسیم اور تفرقات کے سبب اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔

دوسری طرف امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا اعلان کر دیا ہے، لیکن درحقیقت مختلف دہشت گرد گروہوں کے خلاف مختلف حکومتوں کی طرف سے کئی جنگیں جاری ہیں۔ امریکہ کی بنیادی دلچسپی القاعدہ کے ساتھ ہے۔ دیگر حکومتیں مقامی دہشت گردوں کے خلاف کارروائیوں میں دلچسپی رکھتی ہیں۔

عمومی طور پر تہذیبوں کے تصادم کی شروعات ہو چکی ہیں۔ ۱۱ ستمبر کے واقعات کے خلاف ردعمل اور امریکی جواب تہذیبی خطوط پر ہی سامنے آئے ہیں۔ مغربی ممالک کی حکومتوں اور عوام نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ یہ بات برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے حوالے سے خصوصاً سچ ہے۔ یہ معاشرے امریکیوں کے ساتھ ثقافتی یگانگت رکھتے ہیں اور انہوں نے اس جنگ کے لیے بلا تاخیر اپنی فوجیں مہیا کر دیں۔ ان کے علاوہ جرمنی، فرانس اور دیگر یورپی اقوام نے بھی جو امریکہ اور اس کے مقاصد کے ساتھ ہم آہنگی کا اظہار کرتے ہیں، بھرپور ساتھ دیا۔ ان اقوام نے امریکہ پر حملے کو خود اپنے اوپر حملہ تصور کیا جس کا اظہار معروف فرانسیسی رسالے ''لی مونڈے'' (Le Monde) کی اس سرخی سے ہوتا ہے ''ہم سب امریکی ہیں''۔ برلن کے شہریوں نے جو اعلان کیا اس سے صدر کینیڈی کے مشہور جملے کی یاد تازہ ہوئی کہ ''ہم نیو یارکرز ہیں''۔

غیر مغربی اور غیر مسلم تہذیبوں میں سے روس، چین، بھارت، جاپان نے بھی مثالی ہمدردی اور مددگاری کا اظہار کیا۔ تقریباً تمام مسلم حکومتوں نے ان دہشت گرد حملوں کی مذمت کی۔ وہ مسلم انتہا پسند

گروہوں کی طرف سے خود اپنی آمرانہ حکومتوں کے خلاف ممکنہ حملوں سے بھی خوف زدہ تھے۔ تاہم صرف ازبکستان، پاکستان اور ترکی نے امریکی جوابی حملے میں براہ راست امداد فراہم کی۔ جبکہ اہم عرب حکومتوں میں سے صرف اردن اور مصر اس سلسلے میں آگے آئے۔ اکثر مسلم ممالک میں اکثر لوگوں نے دہشت گردی کے واقعات کی مذمت کی، ایک محدود اقلیت نے ان کی حمایت کی، بڑھاوا دیا اور خوشی کا اظہار کیا۔ جبکہ ایک بہت بڑی تعداد نے امریکی جوابی کارروائی پر غم و غصے کا اظہار کیا۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی اپنے مخالفین کے خلاف فوجی کارروائیاں جتنی طوالت اور شدت اختیار کریں گی، مسلم ردعمل بھی اسی تناسب سے بڑھتا اور شدت اختیار کرتا چلا جائے گا۔ ۱۱ ستمبر کے واقعات سے مغربی اتحاد پیدا ہوا ہے، جبکہ ۱۱ ستمبر کا طویل اور شدید جواب مسلم اتحاد کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔

مسلم جنگوں کا دور اس وقت ختم ہوگا جب اس کی وجوہات تبدیل یا ختم ہوں گی۔ جیسے جیسے نئی نسلیں پیدا ہوں گی، ممکن ہے اسلامی احساس کی شدت میں کمی آئے۔ جیسا کہ ایران میں ہوا ہے۔ مسلمانوں کی مغرب کے خلاف نفرت اور غصہ کو کم کیا جا سکتا ہے اگر اسرائیل کے بارے میں امریکی پالیسی میں تبدیلی آ جائے۔ تاہم آگے جا کر مسلم ممالک میں سماجی، معاشی اور سیاسی حالات میں بہتری پیدا کرنا بھی ضروری ہو گا۔ جو مسلم حکومتیں اپنے عوام کی بنیادی بہبود اور اقتصادی ضروریات کا خیال رکھنے میں ناکام ہو جاتی ہیں اور ان کی شہری آزادیوں کو کچلنے کی کوشش کرتی ہیں وہ اپنے متشدد مخالفین پیدا کرتی ہیں، جو نہ صرف ان کے خلاف ہوتے ہیں بلکہ ان کی مددگار مغربی حکومتوں کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔

ایسی ہی مثال ان غیر مسلم حکومتوں کی ہے، مثلاً روس، بھارت اور اسرائیل، جو اپنی مسلمان آبادیوں کو ان کی مرضی کے خلاف کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی ہیں، جبکہ وہ اپنی حکومتیں چاہتے ہیں، چاہے وہ کتنی بھی خراب کیوں نہ ہوں۔ جہاں آئندہ سالوں میں اسلام کے اندر اتحاد پیدا ہونے کا امکان کم ہے، وہاں آبادیاتی پہلوؤں سے کافی خوش امیدی کی گنجائش ہے۔ اکثر مسلم ممالک میں شرح پیدائش کم ہو رہی ہے۔ بلقان میں خاص طور پر ڈرامائی تبدیلی آئی ہے لیکن سعودی عرب سمیت کچھ مسلم معاشروں میں ابھی تک شرح پیدائش حسب سابق بلند ہے۔ ۲۰۲۰ء تک امید ہے کہ مسلم نوجوانوں کی تعداد میں کمی آ رہی ہوگی۔ تب تک یہ سوچا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے مسلم جنگوں کا دور تاریخ کے صفحات میں گم ہوتا چلا جائے

اور ایک نیا دور پیدا ہو جس میں اقوام عام میں تشدد کی نئی شکلیں غلبہ پا جائیں۔

۱ سیموئیل پی ہنٹنگٹن ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر اور درج ذیل کتاب کے مصنف ہیں: *The Clash of Civilzation and the Remaking of World Order*
[*Simon and Schuster, 1996.*

اسلام اور آخری معرکۂ عظیم

ابو الراوندی *

ترجمہ: عرفان محمود

اچانک ہی یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ جیسے ہر کوئی اسلام کا ماہر ہے۔ صدر اور وزیر اعظم سے لے کر عام افراد تک، سب ہی یہ بتانے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں کہ حقیقی اسلام کیا ہے۔ اگر یہ علم غیر پسندیدہ ناصحین کے لیے اتنا ہی سہل الحصول ہے تو یہ حیرت کی بات ہے کہ اس موضوع پر اتنی زیادہ غلط آراء پائی جاتی ہیں۔ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر بظاہر اس بارے میں اتنا زیادہ جانتے ہیں کہ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ یہ اعلان کر سکتے ہیں کہ جو بھی مسلمان ان کے اپنے تصور اسلام سے مختلف نظریہ رکھتا ہے، وہ صحیح یا معیاری مسلمان نہیں ہے۔ اس تصور کے مطابق حقیقی مسلمان دراصل انگلستان چرچ کے ممبروں ہی کی طرح ہوتے ہیں: نرم و شیریں، خود کو صرف اچھا ہمسایہ ثابت کرنے کی طرف راغب، ''بین المذاہب مکالمے'' میں مصروف اور غالباً نیو لیبر پارٹی کو ووٹ دینے والے!

اسلام کے بارے میں صحیح فکر (right thinking) کے خود ساختہ سرپرست ہمیں بار بار یہ بتانے میں مصروف ہیں کہ یہ تشدد و جارحیت کی بجائے امن و محبت کا مذہب ہے۔ کیا قرآن میں ہر باب کے آغاز میں یہ نہیں لکھا ہوتا کہ: ''رحیم اور مہربان خدا کے نام سے؟'' کون اس سے اختلاف کر سکتا ہے؟ کیا تمام شائستہ اور معقول لوگ یہی جذبہ و خیال نہیں رکھتے؟ قرآن پہلے ہی برطانوی وزیر اعظم کے شبینہ مطالعے کی ایک پسندیدہ کتاب ہے جس کا اظہار انہوں نے امریکہ کے ایک حالیہ دورے کے موقع پر قدرے تفاخر کے ساتھ کیا ہے۔

کیا اعلیٰ دفتروں میں بیٹھنے والے لوگ اتنے احمق اور بے وقوف ہو سکتے ہیں؟ بظاہر اس کے لیے یہ

* Ibu al-Rawandi, "Islam and Armageddon", *Free Inquiry*, Spring 2002, Buffalo, pp. 36-38.

ایک لازمی اہلیت ہے کیونکہ اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں کے لیے یہ زیادہ آسان ہوتا ہے کہ وہ اپنی اخلاقی برتری کے اظہار کے لیے ایسی احمقانہ باتیں تواتر کے ساتھ کریں۔ لیکن اختلافی آوازیں کہاں گئیں؟ وہ لوگ کہاں ہیں جو ان عہدے داروں سے مشکل سوالات کرتے ہیں؟ ممکن ہے وہ اس حماقت کا پردہ چاک کر سکیں۔ کیونکہ یہ سیدھی سادی حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ یقیناً ٹیلی ویژن پر انٹرویو کرنے والے اور وہ صحافی تو ایسا نہیں کر سکتے جنھیں اپنی ذاتی ترقی عزیز ہے۔ بہرحال وہ اس موضوع سے متعلق ان سے زیادہ کچھ جانتے بھی نہیں ہیں جن کا وہ انٹرویو کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ پوری پوری کوشش کرتے ہیں کہ خود کو ''متحمل مزاج''، ''بردبار'' اور ''روادار'' بنا کر پیش کریں کہ کہیں خود ان کے اپنے ساتھ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

یہاں چند سوالات ہیں جو اسلام کے کسی بھی وکیلِ صفائی کے سامنے رکھے جا سکتے ہیں:

۱۔ اگر حقیقی اسلام صرف امن و محبت ہی پر مبنی ہے تو اس نے تاریخ میں ایسی سلطنت کس طرح حاصل کر لی جو اسپین سے ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی؟ کیا محض نرم و شیریں استدلال کے ذریعے؟

۲۔ اسلام کب اپنی ان جارحیتوں پر معذرت کرے گا جو اس نے مشرقِ وسطیٰ سے یونانی/مسیحی تہذیب کی بساط لپیٹنے، ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے اور ۱۵۲۹ء میں ویانا کا محاصرہ کرنے کے دوران انجام دیں؟

۳۔ اگر قرآن تمام کا تمام امن و محبت کے مضامین سے عبارت ہے تو ان آیات کی وضاحت کیسے کی جائے گی:

> ''وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں انہوں نے اپنی زندگیاں آخرت کے بدلے میں بیچ دی ہیں۔ جو اللہ کے لیے لڑتا ہے، خواہ وہ مارا جائے یا فاتح ہو، جلد ہی ہم اسے ایک بڑا انعام دیں گے''۔ (۴:۷۴)

> ''وہ جو ایمان لائے، اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہوئے، وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں''۔ (۴:۷۶)

> ''اے ایمان والو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بناؤ؛ وہ دراصل ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو انہیں دوست بناتا ہے وہ انہی میں سے ہے۔ خدا بے

انصاف لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا''۔(۵:۵۴)

''ان سے لڑو جو نہ خدا پر ایمان لاتے ہیں نہ آخرت پر، نہ جس سے خدا اور رسول نے منع کیا ہے باز آتے ہیں اور نہ دین حق کو تسلیم کرتے ہیں، چاہے یہ لوگ اہل کتاب ہی کیوں نہ ہوں، جب تک وہ جزیہ نہ دیں اور عاجز بن کر نہ رہیں''۔(۹:۲۹)

''جب تم کافروں سے ملو، ان کی گردنیں مارو، پھر جب تم اچھی طرح ان کی بڑی تعداد قتل کر چکو تو انہیں مضبوطی سے باندھ دو، پھر انہیں آزاد کر دو چاہے احسان کر کے یا تاوان وصول کر کے، یہاں تک کہ جنگ ختم ہو جائے''۔۴:۴۷

یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ جو لوگ قرآن کو خدا کا کلام مانتے ہیں، کس طرح ایسی آیات میں ہر طرح کی قابل تصور دہشت گردی کے لیے جواز پا لیتے ہیں۔ جب اس طرح کے قرآنی متن ان وکلاء صفائی کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں تو ان کا عام طور پر ردعمل یہ ہوتا ہے کہ یہ قرآن کے ناقص تراجم ہیں، ان کا عربی متن بالکل مختلف ہے اور ایسی آیات کی تلافی بعض دوسری بہتر آیات کے ذریعے کر دی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے، وحی کے بارے میں مسلم روایات یہ ہیں کہ ابتدائی متون بعد میں نازل ہونے والے متون کے نتیجے میں منسوخ ہو چکے ہیں اور جارحیت پر اکسانے والی تمام آیات ''مدنی'' ہیں جبکہ نرمی اور صبر کی داعی آیات ''مکی'' یعنی ابتدائی زمانے کی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن کی اس آیت: ''مشرکین کو قتل کرو جہاں کہیں انہیں پاؤ'' نے ان ۱۲۴ آیات کو غیر موثر کر دیا ہے جن میں نرمی اور برداشت کی تعلیم دی گئی ہے۔

اسلام میں کوئی پوپ اور کوئی ایسی حتمی اتھارٹی نہیں جو بتا سکے کہ حقیقی اسلام کیا ہے؟ اور قرآنی متون کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ تعبیر و تشریح کے حوالے سے عملاً بے شمار آراء پائی جاتی ہیں۔ وہ لوگ جو مذکورہ بالا قرآنی آیات سے آراستہ سرخ رومال سر پر باندھے ااستمبر جیسے واقعات میں ملوث ہوتے ہیں، خود کو اچھا مسلمان سمجھنے کا ہر طرح سے حق رکھتے ہیں، جو خدا کا کام انجام دے رہے ہیں اور آخرت میں انعام کے مستحق ہیں۔ بلاشبہ ایسے لوگ خود کو معیاری مسلمان تصور کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں بہ نسبت ان مغربی تعلیم یافتہ اور مغربی تراش خراش کے ساتھ مسلم اداروں کی نمائندگی کرنے والے افراد کے، جو ایسے واقعات پر ہمدردی اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں یا معصومانہ مسکراہٹ کے حامل اس صوفی کی نسبت جو ''قلب'' کے

معاملات پر بات کرتا ہے۔ آخر الذکر کا کردار زیادہ کراہت انگیز ہے، کیونکہ اس گروہ کے بہت سے اہداف عسکریت پسندوں کے ساتھ مشترک ہیں، مثلاً خلافت کا احیاء، تاہم ان میں یہ سب کچھ کرنے کی جرأت مفقود ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ ایسی باتیں بہ بانگِ دہل اور فوری طور پر کہہ دی جائیں، کیونکہ کم از کم برطانیہ میں اس بات کا جلد ہی امکان ہے کہ ایسا مواد لکھنے اور شائع کرنے والوں کو مذہبی منافرت پھیلانے کا مرتکب قرار دے دیا جائے*۔ ایسے جذبات برطانیہ کے لبرل دانشوروں میں اتنے عام ہیں کہ ایک بڑی تعداد کا اسلام اختیار نہ کر لینا حیران کن ہے۔ اس کے برعکس، ان فکری حلقوں سے باہر کی دنیا میں یوں ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو اسلام ہی دین حق ہے، اور ایسی صورت میں ہم سب کو مسلمان ہو جانا چاہیے، یا اسلام برحق نہیں ہے، اور اگر یہ برحق نہیں ہے تو انتہائی طور پر نامعقول ہے، چنانچہ اس کے بارے میں ایسا کہنا (جیسا اب تک کہا گیا ہے) کوئی جرم نہیں ہو سکتا۔

بلاشبہ یہاں خوف خونریزی کا ہے۔ مسلمانوں پر جسمانی حملوں کا سبب ان کا خود کو مخصوص لباس کے ذریعے نمایاں رکھنا ہے، جس کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہ ان کے مذہب کی تعلیم ہے، بالخصوص مسلمان عورتوں کے معاملے میں۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ قرآن و احادیث میں کہیں بھی نہیں کہا گیا کہ مسلمان عورتیں لازماً سر پر اسکارف اور لمبے بے شکل لباس پہنیں۔ صرف باحیا لباس کا تقاضا کیا گیا ہے جس کے عملاً کئی اسلوب ہو سکتے ہیں جن میں بعض مغربی ملبوسات بھی شامل ہیں۔ مسلمان عورتوں کے اسکارف پر ہنگامہ ایک بالکل بے بنیاد ہنگامہ آرائی ہے۔ اسکارف پہننا لازمی نہیں ہے۔

یہ بات کہ مسلمان عورتیں اپنے لیے اسکارف کا انتخاب کرتی ہیں، آرائش و زیبائش کے کسی بھی دوسرے فیشن کے حق میں پسندیدگی سے زیادہ اہم نہیں۔ دوسروں کے نزدیک یہ محض جہالت اور تعلیم کی کمی کا نتیجہ ہے جو کہ مسلمانوں میں وبا کی طرح عام ہیں۔ انہیں اپنے معاشروں کی طرف سے یہ باور کرایا گیا ہے کہ ایک خالص مسلمان کو یہی کچھ کرنا ہوتا ہے اور مسلمان عوام کے پاس اس کے خلاف جانے کا کوئی

---

* اس تحریر کے وقت برطانوی حکومت کی طرف سے کسی بھی مذہبی گروہ پر جارحانہ تنقید کو جرم قرار دینے کا ایک بل پیش کیا جا رہا تھا۔ یہ بل ہاؤس آف لارڈز میں مسترد ہو گیا تھا، تاہم شاید جلد ہی اسے دوبارہ پیش کیا جائے گا۔

ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ چیز خاص طور پر تشویش ناک ہے کہ وضع قطع کی یہ پابندیاں لڑکیوں پر چار یا پانچ سال کی عمر سے ہی لگا دی جاتی ہیں حالانکہ قانون کا اطلاق بلوغت سے پہلے نہیں ہوتا۔ لیکن کیا ہم کسی ایسے ٹی وی صحافی کا تصور کر سکتے ہیں جو یہ ساری باتیں تعصب اور کم فہمی کی ''شکار'' مسلمان عورت کے سامنے پیش کر سکے؟ اگر اسلام صرف امن و محبت اور نیک روی کا نام ہے، جیسا کہ ہمیں بتایا جاتا ہے، تو ان چیزوں کے لیے کسی مخصوص لباس یا وضع قطع کی چنداں ضرورت نہیں۔ دراصل مخصوص لباس یا وضع قطع ایک طرح کی خودنمائی کا مظہر ہے کہ: ''مجھے دیکھو، میں کتنی باحیا ہوں، کتنی نیک، کتنی پرکشش، تمہاری بے راہروی پر جیتا جاگتا الزام، مجھے اپنی اور تمہاری بھلائی کے لیے بہر حال خود کو چھپانے کا کھیل کھیلنا ہے''۔

ہمیں مسلسل یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم اسلام کے خلاف کسی جنگ میں مصروف نہیں۔ لیکن اسلام کے خلاف جنگ آخر کیوں نہیں؟ دنیا کی آبادی کے اس ایک ارب حصے کے خلاف جنگ کیوں نہیں جو شب گرفتہ جہالت اور خرافات و توہم کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے؟ اس تصور جہاں کے خلاف جنگ کیوں نہیں جو ہماری ان تمام سیکولر، لبرل، انسان دوست اور جمہوری اقدار کا مدمقابل ہے، جو ہمیں اس قدر عزیز ہیں؟ آخر کیوں نہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب انجیل زدہ احمقوں کی زیر قیادت ہے، جن کی خوش خیالیوں میں ایک ان کا یہ زعم ہے کہ وہ حقیقی اسلام کا ادراک رکھتے ہیں، دوسری طرف ان کے یہ خواب ہیں کہ مغرب خدا سے ڈرنے والا، انجیل کا مطالعہ کرنے والا، چرچ سے وابستہ رہنے والا اور احمقوں کی طرح ہنسانے والے ان گروہوں کی سرزمین ہو جن کی سب سے اعلیٰ قدر دنیا کے اسٹیج پر جتنا طویل عرصہ ممکن ہو، اتراتے اور اکڑتے رہنا ہے۔ ایسے لوگوں کی بہ نسبت، یہ ہائی جیکر ہیرو دکھائی دیتے ہیں!

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ۱۱ ستمبر کے واقعات تہذیبوں یا نظریات کا تصادم نہیں ہیں، حالانکہ یہ واقعات بالکل یہی کچھ ہیں۔ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دو ٹاور سب سے پہلے نشانہ بنے۔ دراصل بہت سے مسلمان یہ سوچ رکھتے ہیں کہ بلند و بالا عمارتیں ملحدانہ غرور، نخوت اور خدا سے سرکشی کی علامتیں ہیں اور قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس حقیقت نے بھی ان ٹاوروں کی زمین بوسی پر مسلمانوں کے اطمینان و مسرت میں اضافہ کیا ہے کہ یہ یہودیوں اور عیسائیوں کی اس سودی تجارت اور معاشی طاقت کی علامت ہیں جس کے ذریعے سے مسلم دنیا کا استحصال کیا جاتا ہے۔ بالخصوص جبکہ انہیں منہدم کرنے میں

صرف دس ہی جانوں کی قربانی دینا پڑی۔ باقی یہ کوئی تشویش طلب امر نہیں کہ حملے کے وقت ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں مسلمان بھی موجود تھے کیونکہ ان کی تقدیر مذکورہ بالا قرآنی آیات (۹:۲۹، ۵:۵۴) کے تحت پہلے ہی متعین کر دی گئی تھی۔

افغانستان پر حملے کا سبب اور مقصد ''انصاف'' قرار دیا جاتا ہے گویا کہ اس لفظ کے مفہوم پر کوئی بین الاقوامی اتفاق رائے طے پا چکا ہے۔ اس حوالے سے صرف یہ پوچھا جانا چاہیے کہ: ''کس کا انصاف، میرا یا آپ کا، ہمارا یا ان کا، انسانوں کا یا خدا کا''؟ بین الاقوامی قانون میں کتنی کچھ شریعت موجود ہے؟ اس قانون نے کہاں سے جنم لیا؛ اسے کس نے اور کس مقصد کے تحت مرتب کیا؟ یہ کس دنیا سے آیا؟ کیسی دنیا یہ بنائی جا رہی ہے؟ یقیناً یہ دنیا بادشاہانہ خلافت کی نہ ہوگی جہاں مسلمانوں کا انصاف تقریباً چودہ سو سالوں تک غالب رہا۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ اور افغانستان پر کیے گئے دونوں طرح کے حملوں میں یہ خرابی ہے کہ ان میں معصوم زندگیاں ہلاک ہوتی ہیں، مگر کون ہے جو ایسے موقعوں پر معصوم جانوں کی قربانی نہ دینا چاہے گا جبکہ [illegible] ان کے لیے موزوں ہو؟ اہل مغرب نے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۵ء کے درمیانی عرصے میں صرف یورپ میں ایک سو ملین عام شہریوں کو، ایک یا دوسرے جواز کے تحت، زندگی کے حق سے محروم کیا۔ ہلاکتوں کی یہ تعداد مقاصد کے حصول میں جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ اس سے پہلے بھی ایسے مقاصد پائے جاتے تھے مگر اس وقت لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کو قتل کرنا ممکن نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب مقاصد پر یقین ہی کون رکھتا ہے؟ حتیٰ کہ جدید مسلمانوں کی اکثریت بھی مقدس جہاد کے نام پر گردنیں کٹوانے کو تیار نہیں۔ بیشتر اہل مغرب کی طرح، ان مسلمانوں کا مطمح نظر بھی دولت، جنس اور ایسی آسودہ حال زندگی ہے جس کے ساتھ تھوڑے سے مذہب کا ضمیمہ بھی گروہی تشخص، تسلی و تشفی اور ممکنہ طور پر آئندہ زندگی میں بہتر مستقبل کی ضمانت کے لیے لگا ہو۔ مذہب نے اب تک اپنا وجود برقرار رکھا ہے اور غالباً ہمیشہ برقرار رکھے گا، اس وجہ سے نہیں کہ یہ حق ہے بلکہ اس وجہ سے کہ انسان جذباتی لحاظ سے غیر متوازن ہیں۔

بہر حال ہمیں جنگ کی ضرورت ہے کہ ایک پُرامن عالمی ماحول ذہنوں پر جمود طاری کرنے اور [illegible] کر دینے والا ہوگا۔ شاید اسامہ اور اس کے ساتھی اور کئی افراد کی طرح ترگنیف (Turgenev)

کے باساروف* (Basarov) کے سچے پیروکار ہیں جو کسی بھی مقصد یا مقصد کے بغیر بھی سرگرم ہو سکتے ہیں: ہمیں دہشت گردی کرنا ہے، مقصد و فائدہ ہماری بلا جانے۔ روسی لا وجودی (Nihilist) مصنف دمتری پیساریف (Dmitri Pisarev) کے لافانی الفاظ میں: "یہ ہے ہمارے کیمپ کا الٹی میٹم: جو توڑا جا سکے، اسے توڑ ڈالنا چاہیے، جو حملے کے آگے ٹھہر سکے، وہ اچھا ہے، جو ریزہ ریزہ ہو جائے، وہ بے کار ہے، کسی بھی حال میں، دائیں اور بائیں دونوں پر ضرب لگاؤ، اس سے کچھ نقصان نہ ہوگا اور نہ ہو سکتا ہے"۔

اللہ اکبر

[*ابوالراوندی (Ibu-al-Rawandi) تصوف اور عالمی مذہب کا ایک طالب علم ہے۔ کئی برس تک اس نے ایک مسلمان کی طرح زندگی گزاری اور ایک صوفی شیخ کا مرید رہا۔ وہ ایک کتاب *Islmic Mysticism: A Secular Perspective* کا مصنف ہے۔ اس کے علاوہ اس کے متعدد مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ ابوالراوندی لندن، برطانیہ میں رہائش پذیر ہے۔]

---

* بارساروف ایک روسی ناول کا مرکزی کردار تھا جسے ۱۸۶۲ء میں ایوان ترگنیف (Ivan Turgenev) نے لکھا تھا۔ یہ کردار روسی لا وجودی فلسفے (Nihilism) کی اس وقت ابھرتی ہوئی تحریک کا پہلا ترجمان کردار تھا۔ اس فکر کے مطابق کسی سماجی نظام کو تہ و بالا کرنا چاہیے بغیر اس تردد کے کہ کون سا نظام اس کی جگہ لے گا۔

دہشت گردوں کا اگلا ہدف: دنیائے جدید

تحریر: فرانسس فوکو یاما*

ترجمہ: کرنل (ر) غلام سرور

قرائن سے یوں دکھائی دیتا ہے کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو رونما ہونے والے خونچکاں واقعات نے عالمی سیاست کا رخ یکسر بدل دیا ہے۔ اس حادثہ سے قبل، امریکہ ترقی کی منازل تیزی سے طے کر رہا تھا، کمیونزم کے روپ میں اس کا ایک توانا حریف دم توڑ چکا تھا۔ دنیا میں جمہوریت کے پنپنے کی راہ ہموار ہو گئی تھی۔ اس سے قبل فاشزم اور بادشاہت کا فرسودہ نظام بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا تھا۔ ۱۱ ستمبر سے قبل، امریکی معیشت پھل پھول رہی تھی اور جمہوری ادارے اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا میں برگ و بار لا رہے تھے۔ ٹیکنالوجی کے شعبے میں حیرت انگیز ترقی کے طفیل زمینی فاصلے سمٹ رہے تھے اور قومیت پر مبنی ریاستوں (nation states) کے قیام کا تصور قصۂ پارینہ بنتا جا رہا تھا۔ لیکن آج ہر چیز مختلف دکھائی دے رہی ہے۔

امریکہ نے خود اپنی سرزمین پر بے مثال کامیاب حملوں کے بعد طالبان اور القاعدہ کے خلاف افغانستان میں جنگ شروع کر دی۔ مسلمانوں کی بڑی اکثریت امریکہ مخالفت میں متحرک ہو چکی ہے اور دنیا کے ممالک کو کہا جا رہا ہے کہ وہ اس جنگ میں اپنی اپنی حیثیت کا تعین کریں کہ وہ کس کے ساتھ ہیں۔ امریکہ اور امریکہ سے باہر معیشت ہر جگہ انحطاط کا شکار ہو چکی ہے، کیونکہ سلامتی سے متعلق خدشات نے معیشت کی ترقی کی رفتار کو شدید دھچکا پہنچایا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ آخر کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہم آج سے کچھ عرصہ قبل پیش کیے جانے والے نظریے ''تہذیبوں کے تصادم'' (Clash of Civilization) کی عملی تفسیر دیکھ رہے ہیں، جس

* Francis Fukuyama, "Their Target: The Modern World (the Real Enemy)", Newsweek, Special Daves Edition, Dec. 2001 - Feb. 2002, pp. 54 - 59.

میں مغرب کو اسلام کے مقابل کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ایک ایسا تنازع جو افغانستان کے میدان جنگ سے نکل کر دنیا کے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے؟ کیا وہ ٹیکنالوجی جس کے بارے میں خیال تھا کہ وہ آزادی کو فروغ دے گی، مثلاً ہوائی جہازوں، بلند و بالا عمارتوں (skyscrapers) اور علم حیاتیات کی تجربہ گاہوں میں اضافہ ہوگا، وہ ایسے طریقوں سے ہمارے خلاف ہو چکی ہے کہ ہم اب مکمل طور پر اس کا راستہ روک بھی نہیں سکتے؟ کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اسامہ بن لادن، طالبان اور دہشت گردی کے نیٹ ورک کے خاتمے کے بعد ایک دوسرے کو جوڑنے والی عالمی معیشت کی پرانی دنیا بحال ہو جائے گی؟

آج سے کوئی دس سال قبل راقم الحروف (فوکویاما) نے اپنا ''تاریخ کے نقطۂ انتہا'' (End of History) کا نظریہ پیش کیا تھا کہ انسانیت نے ارتقائی منازل کچھ اس انداز سے طے کر لی ہیں کہ اب وہ تاریخ کی بساط لپیٹ دینے کے مدار میں داخل ہو چکی ہے۔ اس دعویٰ سے میری مراد ہرگز یہ نہ تھی کہ اب تاریخ کا حرکی عمل بالکل منجمد ہو کر رہ جائے گا۔ میرا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ تاریخ جسے بالعموم حکومت کی مختلف شکلوں کے ساتھ انسانی معاشروں کے ارتقاء کے تناظر میں سمجھا جاتا تھا، جدید آزاد رو جمہوریت اور منڈی کی معیشت سے جنم لینے والے سرمایہ دارانہ نظام کے فروغ کے ساتھ ہی اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرا یہ نظریہ ۱۱ستمبر کے واقعات کے باوجود اپنی جگہ پر درست ہے۔ امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ جمہوریتیں جس جدیدیت کی نمائندگی کرتی ہیں، عالمی سیاست میں اس کا وجود غالب طاقت کے طور پر موجود رہے گا۔ دنیا بھر میں ان اداروں کا فروغ جاری رہے گا جن کی تشکیل مغرب کے اساسی اصولوں یعنی ''آزادی'' اور ''مساوات'' کی مرہون منت ہے۔

لیکن ہمیں اس چیلنج کو سنجیدگی سے سمجھنے کی ضرورت ہے جس کا فوری طور پر سامنا ہے۔ ایک ایسی تحریک، خواہ اس کی نمائندگی لوگوں کی ایک محدود تعداد ہی کیوں نہ کر رہی ہو، اگر جدید دنیا کو شدید ترین نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتی ہے تو اس امر سے ہماری تہذیب کی نمو پذیری کے حوالے سے حقیقی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکیوں کو جس کلیدی سوال کا سامنا ہے وہ یہ ہے کہ دہشت گردی کا یہ بنیادی چیلنج کتنا گہرا ہے، کون کون اس میں ہمارا اتحادی بن سکتا ہے اور اس کے مقابلے کے لیے کیا کچھ کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہے؟

تہذیبوں کا ایک تصادم

معروف مفکر اور دانشور سیموئیل ہنٹنگٹن (Samuel Huntington) کا کہنا ہے کہ حالیہ دور میں رونما ہونے والی یہ کشمکش، آگے چل کر تہذیبوں کے تصادم کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ جس کی پیشین گوئی انہوں نے برسوں پہلے کی تھی کہ ایسا تصادم سرد جنگ کے بعد کی دنیا کو تہ و بالا کر سکتا ہے۔ اگر چہ بش انتظامیہ کا یہ کہنا بجا ہے کہ موجودہ لڑائی دہشت گردوں کے خلاف ہے نہ کہ اسلام اور مغرب کے درمیان جنگ، تاہم اس جنگ میں ثقافتی و تہذیبی مسائل کا عمل دخل واضح نظر آتا ہے۔

امریکیوں کو یقین ہے کہ جمہوریت، انفرادی حقوق، قانون کی حکمرانی اور معاشی آزادی سے حاصل شدہ خوشحالی پر مبنی ان کے ادارے اور اقدار عالمی سطح پر انسانوں کی توقعات اور خواہشات کی مجموعی طور پر نمائندگی کرتے ہیں اور اگر موقع ملا تو یہ دنیا بھر کے انسانوں کی آواز بن جائیں گے۔ وہ یہ سوچنے پر مائل ہیں کہ امریکی معاشرہ تمام ثقافتوں کے لوگوں کے لیے کشش رکھتا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک سے لکھو کھا آبادکاروں کی امریکی اور دیگر ترقی یافتہ معاشروں میں آمد ہی اس حقیقت کا ثبوت ہے۔

لیکن ۱۱ ستمبر کے بعد رونما ہونے والے واقعات اس نقطۂ نظر کو چیلنج کرتے ہیں۔ محمد عطا اور جہاز اغوا کرنے والے اس کے دیگر ساتھی سب کے سب تعلیم یافتہ نوجوان تھے جو مغرب میں رہے اور مغربی درس گاہوں میں جنہوں نے تعلیم پائی۔ نہ صرف وہ مغرب سے متاثر نہ ہوئے بلکہ ان کا ردِ عمل اتنا شدید تھا کہ وہ جہازوں کو عمارتوں سے ٹکرانے اور ان ہزاروں لوگوں کو ہلاک کرنے کے لیے تیار ہو گئے جن کے درمیان وہ رہتے تھے۔ یہاں ثقافتی فاصلہ، اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھی اسلامی بنیاد پرستوں کی مثالوں کے ذریعے مکمل اور بھرپور دکھائی دیتا ہے۔ تو کیا یہ ثقافتی لحاظ سے محض ہماری کوتاہ بینی ہے کہ ہم مغربی اقدار کو عالمی اقدار تصور کر بیٹھے ہیں؟

تاریخ کی منطق

درحقیقت اس یقین کی وجوہات موجود ہیں کہ مغربی اقدار اور ادارے، اگر بہت سے غیر مغربی لوگوں کے لیے نہیں تو بھی اکثر انسانوں کے لیے بے پناہ کشش رکھتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا

سکتا کہ جمہوریت اور سرمایہ داریت کا مسیحیت سے تاریخی رشتہ ہے۔ نہ ہی اس حقیقت کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ جمہوریت کی ثقافتی جڑیں یورپ میں ہیں۔ جیسا کہ ایلیکس ڈی ٹکیاولی اور جارج ہیگل سے فریڈرک نٹشے تک مفکرین نے نشان دہی کی ہے کہ جدید جمہوریت، عالمی انسانی مساوات کے مسیحی عقیدے کی لادینی شکل (secularized version) ہے۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغربی ادارے سائنسی طریقہ کار کی مانند ہیں جو دریافت تو مغرب میں ہوئے ہیں لیکن اپنے اندر عالمی سطح پر ہر جگہ منطبق ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک تاریخی عمل (historical mechanism) ایسا ہے جس کے تحت مختلف ثقافتی سرحدوں کے مابین طویل المدت تبدیلی انجام پاتی ہے۔ سب سے پہلے اور زیادہ طاقت کے ساتھ اقتصادیات میں، پھر سیاست کی اقلیم میں اور پھر بالآخر ثقافت میں۔ اور یہ آخری تبدیلی بعینہ نہیں بلکہ زیادہ فاصلاتی ہے۔

سب سے پہلے یہ عمل جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے آگے بڑھتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مادی دولت اور جنگ کے ہتھیار پیدا کرنے کی صلاحیت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ عملاً تمام معاشرے اسے لازماً حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ٹیکنالوجی مسلمانوں اور چینیوں کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی مغرب کے لوگوں کے لیے اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لیے پیداوار میں اضافہ کرنے والے آزاد معیشت اور قانون کی حکمرانی جیسے مخصوص معاشی اصولوں اور اداروں کا اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی سے فروغ پانے والی مارکیٹ اکانومی فرد کی آزادی کی بنیاد پر پھلتی پھولتی ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں حکومتوں یا مذہبی علماء کے بجائے افراد قیمتوں اور شرح سود کا تعین کرتے ہیں۔

معاشی ترقی جواب میں آزادرُو جمہوریت کی وجہ بنتی ہے۔ اگرچہ یہ ہر صورت میں لازمی نہیں تاہم اکثر صورتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ ترقی اور جمہوریت میں تعلق کو علم سیاسیات کے چند عمومی طور تسلیم شدہ اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ معاشی ترقی سے ایک حقِ جائیداد رکھنے والا متوسط طبقہ اور ایک پیچیدہ اور آزادرُو معاشرہ (civil society) جنم لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کی شرح بہت بلند ہو جاتی ہے تاکہ اس معاشی ترقی کی رفتار برقرار رہے۔ یہ تمام عوامل وہ زرخیز فضا پیدا کرتے ہیں جس میں جمہوری سیاسی شراکت کے مطالبے زور پکڑتے ہیں اور بالآخر جمہوری حکومت کے قیام پر منتج ہوتے ہیں۔

ثقافت جس میں مذہبی عقائد، سماجی عادات اور قدیم روایات شامل ہیں، سب سے آخر میں تبدیل ہوتی ہے اور یہی سب سے کمزور میدان بھی ہے۔ معاشرے گہری جڑیں رکھنے والی اقدار کو چھوڑ دینا پسند نہیں کرتے اور یہ سوچنا بہت سادگی ہوگی کہ امریکی مقبول ثقافت، جو اگرچہ ترغیب انگیز ہے، اتنی جلدی ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ یقیناً میکڈونلڈ اور ہالی ووڈ نے دنیا بھر میں عالمگیریت کے امکانات کے خلاف قابل لحاظ ردعمل پیدا کیا ہے۔

لیکن جدید معاشروں میں جہاں ثقافتی اختلافات موجود ہیں، وہاں انہیں سیاست سے باہر اور انسان کی ذاتی زندگی کی حدود میں رکھنے کا رجحان ہے۔ اس کی وجہ بہت سادہ سی ہے: اگر سیاست کی بنیاد مثلاً مذہب پر ہو تو کبھی بھی امن کا برقرار رکھنا ناممکن ہوگا کیونکہ لوگ بنیادی مذہبی اقدار پر متفق نہیں ہو سکتے۔

مغرب میں ایک لحاظ سے سیکولرزم ایک حالیہ پیش رفت ہے۔ یورپ میں مسیحی حکمران اور پادری خود کو اپنی رعایا کے مذہبی عقائد کے تحفظ کے ذمہ دار تصور کرتے تھے اور اختلاف کرنے والوں کو سزا دیتے تھے۔ جدید سیکولر جمہوری ریاست یورپ میں سولہویں اور سترہویں صدی کے خونی مذہبی تنازعات سے ابھری ہے جن میں مختلف مسیحی گروہوں نے بے رحمی سے ایک دوسرے کا قتل عام کیا۔ چنانچہ شہریوں میں امن کو قائم کرنے کے لیے چرچ اور ریاست کی علیحدگی ایک ضرورت بن گئی جو جدیدیت کے عمل کا ایک لازمی حصہ ہے۔ یہی وہ حیران کن نظریہ ہے جو ہابس اور لاک نے کمال مہارت سے پیش کیا ہے اور جو امریکی اعلانِ آزادی اور امریکی آئین کی صورت میں منتج ہوا ہے۔

جدیدیت (modernization) کی تہہ میں یہی وہ منطق ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی اقدار مغربی مسیحیت سے نکلنے والی کوئی خودسر ثقافتی شاخیں نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک زیادہ عالمگیر عمل (universal process) متشکل ہوا ہے۔ چنانچہ ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں ایسی ثقافتیں یا ممالک موجود ہیں جو جدیدیت کے اس عمل کی راہ میں مزاحم ہوں گے؟ یا اسے روک دیں گے؟

مغرب بمقابلہ دیگر دنیا

اگر ہم ایشیا پر نگاہ ڈالیں تو وہاں ہمیں جدیدیت کی راہ میں خاص ناقابل عبور رکاوٹیں نظر نہیں آتیں۔ سنگاپور کے سابق وزیر اعظم لی کوان یو کہا کرتے تھے کہ ایشیائی قدریں مطلق العنانیت کی حمایت کرتی ہیں نہ کہ جمہوریت کی۔ لیکن حالیہ برسوں میں جنوبی کوریا اور تائیوان نے دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ جمہوریت کی طرف پیش قدمی کی ہے۔ بھارت ۱۹۴۸ء میں اپنی آزادی سے لے کر اب تک کامیاب جمہوریت ہے۔ اور حال ہی میں اس نے معاشی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا ہے جو غربت سے نکلنے میں بھی اس کی مدد کر سکتا ہے۔

لاطینی امریکہ اور یورپ کی سابق کمیونسٹ ریاستوں میں ثقافتی رکاوٹیں اور بھی کم ہیں۔ ان کا مسئلہ جدیدیت کا مقصد حاصل کرنے میں عملاً ناکامی کا ہے جبکہ انہیں جدیدیت کی منزل سے بطور مقصد کوئی اختلاف نہیں ہے۔ تحت صحارا افریقہ میں ایڈز سے لے کر خانہ جنگی اور بُری حکومت تک کئی مسائل ہیں۔ لیکن یہ دیکھنا مشکل ہے کہ وہاں کی متنوع ثقافتی روایات اپنے معاشروں کو جدید بننے سے کیسے روک سکیں گی، اگر وہ دیگر معاملات میں اکٹھے ہو کر اپنے کام کرنے لگیں۔

صرف اسلام دنیا کی وہ واحد ثقافت ہے جسے جدیدیت کے ساتھ کچھ بنیادی مسائل درپیش ہیں۔ البتہ اس پر بحث کی گنجائش موجود ہے۔ مسلمان معاشرے اپنی تمام تر مہارت اور اہلیت کے باوجود صرف ایک عملی جمہوریت (ترکی) پر کچھ فخر کر سکتے ہیں جبکہ انہوں نے کوریا اور سنگاپور کی طرح کوئی زبردست معاشی کامیابی بھی حاصل نہیں کی ہے۔

اسلام کیسے مختلف ہے؟

یہ لازمی نہیں کہ اسلام میں بطور مذہب کوئی ایسی شے ہے جو اسے جدیدیت کا دشمن بناتی ہے۔ عیسائیت، ہندوازم، کنفیوشسزم یا دنیا کی دیگر عظیم مذہبی یا ثقافتی روایات کی طرح، اسلام بھی غیر معمولی پیچیدگی کا حامل ایک نظام ہے جس نے وقت کے ساتھ ساتھ کئی انداز میں ارتقاء کے مراحل طے کیے ہیں۔ جس دوران مسیحی یورپ مذہبی خانہ جنگی کا شکار تھا مسلمانوں کے مختلف فرقے خلافت عثمانیہ کے تحت پرامن

زندگی گزار رہے تھے۔ انیسویں اور اوائل بیسویں صدی میں مصر، ایران اور ترکی کے اسلام میں اہم لبرل رجحانات موجود تھے۔ کمال اتاترک کی جمہوریہ ترکی انہی رجحانات کے نتیجے میں جدید تاریخ کی مکمل سیکولر ریاستوں میں ایک ریاست بن گئی۔

اسلامی دنیا آج کی دیگر ثقافتوں سے ایک اہم حوالے سے مختلف ہے۔ حالیہ سالوں میں واحد اس مذہب نے بار بار اہم انتہا پسند اسلامی تحریکوں کو جنم دیا ہے جو محض مغربی پالیسیوں کے خلاف نہیں ہیں بلکہ جدیدیت کے ایک انتہائی بنیادی اصول یعنی مذہبی رواداری کو بھی رد کرتی ہیں۔ ان گروہوں نے اا ستمبر کے سانحے پر اس لیے خوشیاں منائیں کیونکہ اس واقعہ سے اس معاشرے کو نقصان پہنچا جو ان کے خیال میں اپنی بنیاد سے ہی خراب ہے۔ یہ خرابی صرف جنسی آزادی، ہم جنس پرستی اور خواتین کے حقوق سے متعلق نہیں ہے بلکہ سیکولرزم کے بارے میں ان کے خیالات اس کا سبب ہیں۔

انہیں اس چیز سے نفرت ہے کہ مغربی معاشروں میں ریاست مذہبی سچائی کے تحفظ کے بجائے مذہبی برداشت اور کثرتیت (pluralism) کو تقویت پہنچاتی ہے۔ ایشیا، لاطینی امریکہ، سابق اشتراکی ریاستوں یا افریقہ کے عوام مغربی صارفیت پسندی (consumerism) پر مبنی اقدار میں کشش محسوس کرتے ہیں اور ان کے لیے اگر ممکن ہو تو انہیں اپنے ہاں بھی رائج کرنا چاہتے ہیں جبکہ سعودی وہابیوں، اسامہ بن لادن یا طالبان جیسے بنیاد پرست انہیں مغربی زوال کا ایک ثبوت سمجھتے ہیں۔

چنانچہ یہ محض دہشت گردوں کے خلاف ایک جنگ نہیں ہے جیسا کہ امریکی حکومت قابل فہم طور پر کہتی ہے نہ ہی اصل مسئلہ فلسطین یا عراق کے بارے میں امریکی پالیسی کا ہے، جیسے بہت سے مسلمان دعویٰ کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے بنیادی اختلاف یا تنازعہ بہت گہرا ہے اور اس کا تعلق صرف دہشت گردوں کے ایک چھوٹے سے گروپ سے نہیں ہے بلکہ انتہا پسند اسلامیوں اور مسلمانوں کے ایک کہیں بڑے گروپ سے ہے جن کے نزدیک مذہبی شناخت دیگر سیاسی اقدار سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

یہ انتہا پرست اسلامیت (radical islamism) ہی ہے جو شکایتوں، دکھوں اور محرومیوں کے احساس کا وہ پس منظر تشکیل دیتی ہے جو نہ صرف بہت گہرا ہے بلکہ متقابلتاً حقیقت سے کٹا ہوا بھی ہے۔ یہ اسی طرح کا اسلام پسند ہے جو یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں کہ عالمی تجارتی مرکز پر حملے میں مسلمان

ملوث تھے بلکہ اسے اسرائیل کی کارستانی قرار دیتا ہے۔ وہ امریکی پالیسی پر اعتراض کرتے ہیں بلکہ وہ اسے مسلمانوں کے خلاف بہت بڑی سازش کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ماضی میں امریکی پالیسی نے صومالیہ، بوسنیا، کوسووا اور چیچنیا میں مسلمانوں کی حمایت اور مدد کی ہے۔

اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اصل جنگ صرف حقیقی دہشت گردوں کے ساتھ نہیں بلکہ انتہا پسند اسلامیوں کے ساتھ ہے، جو دنیا کو مومنوں اور کافروں کے درمیان ازلی جنگ کا میدان قرار دیتے ہیں تو پھر ہم ایک مختصر اور دنیا سے کٹے ہوئے گروپ کی بات نہیں کر رہے ہیں۔ ۱۱ ستمبر کے بعد سے اسامہ بن لادن کو مسلم دنیا کے طول و عرض سے گہری ہمدردیاں حاصل ہوئی ہیں کیونکہ وہ امریکہ کے خلاف کھڑا ہوا ہے۔ اسے کراچی کی کچی آبادیوں سے لے کر بیروت اور قاہرہ کے پیشہ ور ماہرین تک اور برطانیہ اور فرانس میں مقیم پاکستانی اور الجزائری شہریوں تک سب کی ہمدردیاں ملی ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے امور کے ماہر ڈینیل پائپس کے اندازے کے مطابق اس انتہا پسند آبادی کی تعداد کل مسلم دنیا کا ۱۰ سے ۱۵ فیصد بنتی ہے۔

اسلام میں فاشزم کے اجزاء (Islamo-Fascism)

سوال یہ ہے کہ اس انتہا پسند اسلامیت (redical Islamism) نے کیسے اچانک فروغ پایا ہے۔ سماجی لحاظ سے اس کی وجوہات بیسویں صدی کے اوائل میں یورپی فاشزم کے ابھرنے کی وجوہات سے مختلف نہیں ہوں گی۔ اسلامی دنیا میں ایک بڑی آبادی نے قبائلی زندگی اور روایتی گاؤں سے نقل مکانی کی ہے۔ ان میں سے اکثر شہروں میں آباد ہوگئے ہیں۔ یہاں ان کا تعارف اسلام کی ایک زیادہ تجریدی علمی شکل سے ہوا ہے جو مذہب کے خالص تصور کی طرف واپسی کی دعوت دیتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے انتہا پسند جرمنی قوم پرستوں نے ایک مردہ نسلی شناخت کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔

انتہا پسند اسلام کی نئی شکل مسلمانوں کے لیے بے پناہ کشش رکھتی ہے کیونکہ یہ ان اقدار اور ثقافت کی بحالی کا دعویٰ کرتی ہے جنہیں جدیدیت کے عمل نے مسخ کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ کہنے سے معاملہ واضح ہو جاتا ہے کہ حالیہ تنازعہ، محض دہشت گردی کے خلاف لڑائی نہیں ہے نہ اسلام کے خلاف بطور مذہب یا تہذیب یہ کوئی جنگ ہے بلکہ یہ جنگ اسلاموفاشزم کے خلاف ہے۔ یعنی اس انتہائی عدم برداشت کے

حال اور جدیدیت کے مخالف عقیدے کے خلاف جو حال ہی میں مسلم دنیا کے بہت سے حصوں میں ابھرا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں اسلام میں جن انتہا پسند نظریات نے فروغ پایا ہے اس کی زیادہ تر ذمہ داری سعودی عرب پر عائد ہوتی ہے۔ سعودی شاہی خاندان نے گزشتہ برسوں میں وہاں اسلام کی ترویج کے ذریعے علماء کی طرف سے اپنی حکومت کا جواز اور تحفظ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سعودی حکمرانوں نے اسی اور نوے کی دہائیوں میں خصوصاً ۱۹۷۹ء میں مسجد الحرام پر [ایرانیوں کے] ناکام قبضے کے بعد اپنے خاص برانڈ کے اسلام کو فروغ دینے کے لیے بہت بڑی سرمایہ کاری کی ہے۔ وہابی نظریے کو بڑی آسانی سے اسلاموفاشزم کے مساوی ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ سعودی عرب میں دسویں جماعت کے طالب علموں کو نصاب میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ ''مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ وفادار رہیں اور کافروں کو اپنا دشمن سمجھیں''۔

سعودی حکمرانوں نے اس عقیدے کا پرچار صرف مشرقِ وسطیٰ تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ خود امریکہ میں بھی اسے پھیلا دیا ہے۔ جہاں انہوں نے اپنے مخصوص اسلام کی ترویج کے لیے کروڑوں کی رقم سکولوں اور مسجدوں کی تعمیر میں صرف کی ہے۔ خلیج سے آنے والی اس رقم سے اسامہ بن لادن اور اس کے پیروکار اس قابل ہوئے کہ وہ اپنے لیے ایک ملک، افغانستان، کو خرید لیں اور اس کو اساس کے طور پر استعمال کرتے ہوئے عرب جنونیوں کی ایک پوری نسل کی تربیت کریں۔ اس عمل کے لیے امریکہ بھی اتنا ہی قصوروار ہے جو روسی فوجوں کے انخلا کے بعد افغانستان سے واپس چلا آیا اور اس نے وہاں ایک مستحکم اور جدید سیاسی نظام کے قیام کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے عشروں میں اسلاموفاشزم کے فروغ کی آخری وجہ مشرقِ وسطیٰ میں غربت، معاشی بدحالی اور مطلق العنان سیاست ہے۔ یہ وہ عناصر ہیں جن سے سیاسی انتہاپسندی کا خام مال تیار ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس اصل وجہ کا سراغ لگائیں جو ان وجوہات کے پس پشت موجود ہے۔ اس الزام کی روشنی میں کہ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کسی نہ کسی طرح ان وجوہات کو دور کرنے کی کوشش کر سکتے تھے، جو انہوں نے نہیں کی۔

درحقیقت، بیرونی ممالک، عالمی بنک جیسے بین الاقوامی اداروں کے ذریعے مسلمان ممالک کی مدد کرتے رہے ہیں جیسے امریکہ نے مصر اور اردن جیسی اقوام کے ساتھ دوطرفہ معاملات طے کر کے ان کی مدد کی۔ تاہم اس امداد کا بہت کم حصہ کسی اچھے کام آ سکا ہے کیونکہ مسلم دنیا میں مسئلے کی اصل نوعیت سیاسی ہے۔ معاشی اور سیاسی اصلاحات کے لیے ہمیشہ سے مواقع موجود رہے ہیں لیکن بہت کم مسلم حکومتوں نے اور عرب حکومتوں نے تو بالکل نہیں، وہ پالیسیاں اختیار کی ہیں جو جنوبی کوریا، تائیوان، چلی یا میکسیکو نے عالمی معیشت کے لیے اپنے دروازے کھول کر پائیدار ترقی کی بنیاد ڈالنے کے لیے اختیار کیں۔

کسی بھی عرب حکومت نے رضاکارانہ حکومت چھوڑ کر جمہوری حکومت کے قیام کے لیے راہ ہموار نہیں کی۔ جیسا کہ ڈکٹیٹر فرانکو کے بعد سپین کی بادشاہت نے کیا، یا تائیوان کے قوم پرستوں نے، یا ارجنٹائن، برازیل، چلی اور لاطینی امریکہ کے دوسرے فوجی آمروں نے کیا۔ کوئی ایک بھی مثال ایسی نہیں کہ خلیج فارس کی کسی دولت مند ریاست نے اپنی دولت خود انحصار صنعتی معاشرے کے قیام کے لیے خرچ کی ہو۔ بجائے اس کے ان ریاستوں نے ایسا بدعنوان دولت مند طبقہ پیدا کیا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ جنونی اسلام پسند ہوتا چلا گیا۔ مسلم دنیا کے جمود کی اصل وجہ بیرونی دنیا کے کردہ یا ناکردہ گناہ نہیں بلکہ ان کی اپنی ناکامیوں میں پوشیدہ ہے۔

مستقبل کے امکانات

آج امریکہ کو دہشت گردوں کے ایک مختصر گروہ سے نمٹنے کا چیلنج ہی درپیش نہیں ہے بلکہ اسلامو-فاشزم کا سمندر جس میں یہ دہشت گرد تیر رہے ہیں، زیادہ بڑا نظریاتی چیلنج ہے جو بعض اعتبار سے کمیونزم کے چیلنج سے بھی زیادہ بنیادی اور سنگین ہے۔ تاریخ اب یہاں سے کیا رخ اختیار کرے گی؟ کیا انتہا پسند اسلام مغرب پر حملہ کرنے کے لیے زیادہ پیروکار اور زیادہ طاقتور ہتھیار اکٹھے کر لے گا۔ واضح طور پر ہمیں اس کا علم نہیں مگر چند مخصوص عوامل اس ضمن میں ہماری راہنمائی کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ افغانستان میں جاری طالبان اور القاعدہ کے خلاف اور اس سے بھی آگے عراق میں صدام حسین کے خلاف جنگ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ لوگوں کے اس خیال کے برعکس کہ

نظریات کی زندگی اور موت کا دارومدار ان کی داخلی اخلاقی توانائی پر ہے درحقیقت اس میں طاقت زیادہ بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ جرمنی کا فاشزم اپنے اندرونی اخلاقی تضادات کے سبب شکست وریخت کا شکار نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی موت اس لیے واقع ہوئی تھی کہ جرمنی پر بمباری کر کے اسے راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا اور اتحادی فوجوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسامہ بن لادن نے عالمی تجارتی مراکز پر کامیاب حملے کر کے پوری دنیا میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اگر امریکی فوجیں علامتی طور پر، کسی عوامی چوک میں اس کے طالبان محافظین کے ساتھ اسے کسی کھمبے سے لٹکا دیں تو اس کی تحریک اپنی اکثر کشش کھو دے گی۔ اسی طرح اگر فوجی کارروائی غیر مؤثر رہی تو اسلاموفاشزم کو حمایت حاصل ہوگی۔

دوسری اور زیادہ اہم پیش رفت خود اسلام کو اپنے داخل سے برآمد کرنی ہوگی۔ مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا وہ جدیدیت کے ساتھ، خصوصاً سیکولر (لادینی) ریاست اور مذہبی برداشت پر مبنی اس کے کلیدی اصولوں کے ساتھ مصالحت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ مسلم دنیا آج اسی دوراہے پر کھڑی ہے جہاں مسیحی یورپ سترہویں صدی میں تیس سالہ جنگ کے دوران کھڑا تھا۔ مذہبی سیاست لامحدود جھگڑوں کو جنم دے رہی ہے۔ یہ جھگڑے صرف مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان نہیں بلکہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان بھی ہیں۔ (پاکستان میں اکثر حالیہ بم دھماکے سنی-شیعہ تنازعہ کے نتیجے میں ہوئے ہیں۔) حیاتیاتی اور نیوکلیائی ہتھیاروں کے اس دور میں یہ صورت حال سب کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔

توقع کی جا سکتی ہے کہ سیاسی لادینیت (سیکولرزم) کی داخلی منطق کی بنا پر اسلام کی ایک زیادہ آزاد خیال (لبرل) شکل سامنے آئے۔ اسلامی تھیوکریسی لوگوں کو اپنی مجرد شکل میں زیادہ پرکشش نظر آتی ہے۔ جنہیں اس قسم کی حکومتوں کے تحت عملاً رہنے کا موقع ملا ہے، مثلاً ایران یا افغانستان میں، انہیں زیادہ ظالمانہ آمریت کا تجربہ ہوا ہے۔ ان کے لیڈر غربت اور جمود کے مسائل پر قابو پانے میں زیادہ بے سمت ثابت ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ ۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد تہران اور دیگر ایرانی شہروں میں اسلامی حکومت سے تنگ آئے ہوئے لاکھوں نوجوانوں نے زیادہ آزاد سیاسی نظام کے حق میں مظاہرے کیے۔ ان کے لیے ''مرگ بر امریکہ'' کے سابقہ نعرے ''امریکہ ہم تم سے محبت کرتے ہیں''، جیسے نعروں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اس دوران بھی نعرے لگائے گئے جب پڑوسی افغانستان میں طالبان پر امریکی بمباری جاری

تھی۔

واضح طور پر یہ نظر آتا ہے کہ موجودہ مشکل حالات میں اگر کوئی ملک اسلامی دنیا کی قیادت کر سکتا ہے تو وہ ایران ہوگا۔ وہی ملک جہاں ۲۳ سال پہلے شاہ ایران کا تختہ الٹ کر اور آیت اللہ خمینی کو اقتدار دلا کر موجود بنیاد پرست تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ صرف ایک نسل کے بعد اس ملک میں مشکل سے ہی کوئی ایسا ۴۰ برس کا شخص ہوگا جو بنیاد پرستی سے کوئی ہمدردی رکھتا ہو۔ اور اگر ایران اسلام کی کوئی زیادہ جدید اور تحمل مزاج شکل متعارف کرا سکے تو وہ باقی مسلم دنیا کے لیے ایک نہایت طاقت ور مثال بن سکتا ہے۔

جو مسلمان اسلام کی زیادہ لبرل شکل میں دلچسپی رکھتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ مغرب پر الزام تراشی بند کر دیں اور خود اپنے اندر سے انتہا پسندوں کو تنہا اور کمزور کرنے کے لیے کوشش کریں۔ اس بات کی کچھ شہادت موجود ہے کہ یہ عمل پہلے ہی شروع ہو چکا ہے۔ امریکی مسلمان اپنی کمیونٹی میں وہابی اثرات کی حد تک تو بیدار ہو رہے ہیں اور اگر افغانستان میں بنیاد پرستوں کے خلاف جنگ کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ گئی تو دوسرے ملکوں میں رہنے والے لیے بھی ممکن ہے اس حقیقت کا جلد ادراک کر لیں۔

مغربی آزادرو جمہوریت اور اسلاموفاشزم کے درمیان تنازعہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ دونوں مساوی طور پر قابلِ عمل ثقافتی نظام ہیں، جن میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں عبور، دولت پیدا کرنے اور موجودہ دنیا میں تنوع کے مسائل سے نمٹنے کی یکساں صلاحیت موجود ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ مغربی اداروں کو تمام برتری حاصل ہے اور اسی وجہ سے طویل المیعاد بنیاد پر دنیا بھر میں ان کا پھیلاؤ اور مقبولیت جاری رہے گی۔ لیکن طویل المدت ثمرات کے لیے ہمیں لازماً قلیل المدت جنگ میں جیتنا ہوگا۔ لیکن بدقسمتی سے تاریخی عمل کے لیے لازمی نہیں کہ وہ اسی طرح جاری رہے۔ جدید جمہوری معاشرے کی اقدار کے تحفظ کے لیے جنگ میں اعلیٰ قیادت، حوصلہ مندی اور عزم کی ضرورت ہے۔

[فوکویاما، جان ہوپکنز یونیورسٹی امریکہ میں بین الاقوامی سیاسی معاشیات کے پروفیسر اور درج ذیل کتاب کے مصنف ہیں: *The End of History and the Last Man*, The Free Press 1992, New York.]

مذہب کی آڑ میں دہشت گردی

تحریر: یوناہ الیگزینڈر*

ترجمہ: کرنل (ر) غلام سرور

تاریخ کے صفحات میں ہمیں متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں، جہاں مختلف مذاہب کے پیروکاروں نے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو اپنی شدید نفرت اور حقارت کا نشانہ بنائے رکھا۔ اس منفی سوچ کا ہمیشہ یہ برآمد ہوا کہ مذہب اور عقیدے کے تحفظ کی آڑ میں مذہبی عناصر ایک دوسرے کے خلاف آپس میں دست وگریباں ہوتے رہے۔ اسی طرح بے قاعدہ جنگ میں ایک کم خرچ ہتھیار کے طور پر دہشت گردی کا مقصد بھی، قانون سے بالاتر رہتے ہوئے اپنے حریف کے خلاف طاقت استعمال کر کے اسے نفسیاتی طور پر پژمردہ کرنا ہوتا ہے۔ اس دہشت گردی کی جڑیں کافی پرانی ہیں۔

تاریخ کے اوراق پلٹ کر جب ہم دیکھتے ہیں، تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ''زیلٹ سکاری'' (Zealot Sicarii) نامی یہودی مذہبی جنونیوں کی ایک تنظیم نے رومیوں کے خلاف پے در پے حملے کر کے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اسی طرح مشرقِ وسطیٰ میں صلیبیوں کے خلاف فدائین کی طرف سے فدائی حملے کیے جاتے رہے۔ اول الذکر دہشت گرد پہلی صدی میں ۷۰ برسوں تک قتل و غارت کے مذموم کاروبار میں ملوث رہے تھے، جبکہ اس کے برعکس موخرالذکر گروہ کی سرگرمیوں کا دائرہ گیارہویں سے تیرہویں صدی تک دو صدیوں پر محیط رہا تھا۔

آج کے دہشت گردوں نے، جو مذہبی عقائد سے توانائی حاصل کرتے ہیں، تشدد و دہشت گردی کا ایک نیا پیمانہ متعارف کرایا ہے۔ ان کی کارروائیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم دہشت گردی کے ایک دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ قومی، علاقائی اور عالمی تحفظ و سلامتی کے معاملات پر اس کے مضمرات بہت شدید ہیں۔

* Yonah Alexander, "Terrorism in the Name of God", *The World and I*, Oct. 2002, pp 38-43.

غالباً سب سے اہم وہ خطرات ہیں جو عام لوگوں کی بقا، بہبود اور حقوق، ریاستی نظام کے استحکام، معاشی ترقی کی رفتار، جمہوریت کے فروغ اور ممکنہ طور پر تہذیب کی بقا کو لاحق ہیں۔

مذہب کے نام پر جارحیت کا ایک انتہائی گھناؤنا کھیل ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ میں کھیلا گیا۔ اس سانحہ کی مثال جدید دور کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تفصیل کچھ یوں ہے کہ ۱۹ دہشت گردوں نے امریکہ کی ایک فضائی کمپنی کے چار ہوائی جہاز اغوا کر لیے اور انہیں فضا میں بلند کر کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گان سے ٹکرا دیا۔ جبکہ ایک جہاز اپنے مطلوبہ ٹارگٹ پر نہیں پہنچ سکا اور پنسلوانیا کے قریب ایک میدان میں گر گیا۔ اس حادثے میں نا قابل بیان مالی نقصان کے علاوہ، تین ہزار سے زائد افراد ہلاک اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہوئے۔

ان بے مثال حملوں سے، جن کی منصوبہ بندی اسامہ بن لادن کے القاعدہ نیٹ ورک نے کی تھی، سلامتی کے نئے مسائل سامنے آئے ہیں جو تمام تہذیب یافتہ اقوام کے لیے تشویش ناک ہیں۔ یقیناً آنے والے سالوں میں ایسے مزید واقعات رونما ہوں گے۔ مختلف قومیں، تنظیمیں اور افراد، جو ایسے حملوں کی تیاری اور منصوبہ بندی کرتے ہیں، وہ اعلیٰ ترین دہشت گردی (superterrorism) کی طرف جائیں گے چاہے ان کے ہتھیار، حیاتیاتی ہوں، کیمیائی ہوں یا نیوکلیائی۔ جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے یہ دہشت گرد حساس مقامات، معاشی اور دفاعی نظاموں پر سائبر اٹیک بھی کر سکتے ہیں۔ عالمی سلامتی اور تحفظ کو درپیش ان روایتی اور غیر روایتی چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے قومی، علاقائی اور عالمی سطحوں پر موثر کوششیں کرنا ہوں گی۔

زیر نظر مقالہ میں مذہب کے نام پر دو عرب دہشت گرد تنظیموں ''حماس'' اور ''فلسطینی اسلامی جہاد'' کے طریقہ واردات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تنظیمیں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی سلامتی کے لیے خطرے کا موجب بنی ہوئی ہیں۔ یہ تحریکیں ''القاعدہ'' کے عالمی فریم ورک کی رکن ہیں۔ القاعدہ کی کارروائیاں دنیا کے ۸۰ ممالک میں جاری ہیں۔

فلسطین میں مذہبی دہشت گردی

اعلیٰ اسلامی احکام کے نام پر ''مقدس'' دہشت گردی مشرق وسطیٰ میں امن کے قیام کی راہ میں بڑی

رکاوٹ ہے۔ واضح طور پر اسلام کے نام پر بپا کی جانے والی دہشت گردی کی کارروائیاں علاقائی امن اور عالمی استحکام کے لیے زبردست خطرے کا موجب بن رہی ہیں۔ لیکن یہ خطرہ روایتی اسلام یا اسلامی بنیاد پرستی کی جانب سے نہیں ہے جو سماجی اور سیاسی سطح پر اسلامی اقدار کی بنیاد پر نظم قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اصل خطرہ ان انتہا پسند تنظیموں کی جانب سے ہے جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دہشت گردی کا سہارا لیتے ہیں اور اپنے وحشیانہ اقدامات کو اسلام کی غلط تعبیر کے ذریعے جواز فراہم کرتے ہیں۔

اسلامی تحریک مزاحمت ''حماس'' ۱۹۷۸ء میں پہلی انتفادہ (مزاحمتی تحریک) کے آغاز کے کچھ ہی عرصہ بعد باضابطہ طور پر وجود میں آ گئی تھی۔ اس تحریک کی جڑیں ۱۹۴۰ء کی دہائی میں تلاش کی جا سکتی ہیں جب مصر کی اخوان المسلمون نے پہلی انتفادہ کے دوران محسوس کیا کہ ان کی تنظیم کا ایک عسکری بازو بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ حماس ''اخوان المسلمون'' ہی کی توسیع ہے۔ اس تنظیم نے اسرائیل کے خلاف موثر اقدامات کیے اور اس کے وجود کی مخالفت میں نوجوانوں کو تربیت دی۔

''حماس'' کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ غزہ کی پٹی میں اس کا اثر ورسوخ ہے۔ غزہ میں مہاجرین کی سماجی ومعاشی حالت زار اور یہ حقیقت کہ کوئی دوسری قوم پرست جماعت ان کی مدد کے قابل نہیں تھی حماس کی کامیابیوں کا سبب بنی۔ ۱۹۷۰ء کے اواخر اور ۱۹۸۰ء کے عشرے میں پی ایل او کی سرگرمیوں کا مرکز تیونس میں تھا۔ بنابریں فلسطینیوں کی مقامی قیادت کو پنپنے کا موقع ملا۔ حماس کو بھی اپنا سماجی ڈھانچہ تیار کرنے میں کامیابی ہوئی اور وہ پی ایل او کی متبادل تنظیم کے طور پر سامنے آئی۔

اگست ۱۹۸۸ء میں حماس نے اپنا نظریاتی اسلامی منشور شائع کیا۔ اس دستاویز میں اسرائیل اور پی ایل او دونوں کے طریقہ کار کو چیلنج کرتے ہوئے دعویٰ کیا گیا ہے کہ حماس ہی فلسطینی عوام کی واحد جائز اور نمائندہ تنظیم ہے۔ انتفادہ کے دوران تشدد کی کارروائیوں میں حماس کی شرکت سے اس تنظیم کو تحریک مزاحمت میں مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کی مقبولیت اور پھیلاؤ میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

خلیج کی جنگ کے بعد حماس بڑی دہشت گرد تنظیم بن کر ابھری اور الفتح کے بعد، جس کی قیادت یاسر عرفات کے پاس ہے، اس کا شمار فلسطین کے مضبوط ترین مزاحمتی گروپوں میں ہونے لگا۔ ۱۹۹۱ء میں زکریا

ولید آخیل نے عزالدین القصام بٹالین قائم کیا جس نے ایسے افراد کو اغواء اور قتل کرنا شروع کیا جن پر اسرائیل کی معاونت کا شبہ تھا۔ ۱۹۹۲ء میں اسحاق رابن کی حکومت نے حماس اور اسلامی جہاد کے ۴۱۵ کارکنوں کو اسرائیل سے نکال دیا۔ اس پر حماس نے اپنی پالیسی میں تبدیلی کرتے ہوئے حزب اللہ کے طریق کار کے مطابق اسرائیلی عوام اور فوجی اہل کاروں کے خلاف کار بموں، خودکش بمباری اور اغواء جیسے اقدامات کرنے شروع کر دیے۔

۱۹۹۳ء میں اوسلو معاہدے پر دستخط ہوئے اور اسرائیل اور فلسطینی اتھارٹی کے مابین ''ڈیکلریشن آف پرنسپلز'' (declaration of principles) وجود میں آ گیا اور یوں مسئلہ فلسطین کی تزویراتی نوعیت بدل گئی۔ اس معاہدے کی رو سے انتفادہ تحریک کی بساط بھی لپیٹ دی گئی اور ساتھ ہی حماس کی سرگرمیاں ختم کرانے کے لیے اس پر دباؤ بڑھایا جانے لگا۔ بایں ہمہ، حماس کی قیادت نے فلسطینیوں کی صفوں میں اتحاد برقرار رکھتے ہوئے اسرائیل کے خلاف ہر صورت میں جہاد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی خودکش بمباری کے ذریعے تشدد اور دہشت گردی میں اضافہ کر دیا جس نے امن کے عمل میں رکاوٹ پیدا کی اور کئی باران کی مکمل ناکامی کا خطرہ پیدا کر دیا۔

۱۹۹۴ء میں فلسطینی اتھارٹی کے قیام سے ہی حماس نے فلسطینی اتھارٹی کے مقابلے میں ایک مضبوط حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرنے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے متبادل کے طور پر سامنے آنے کی کوشش کی ہے، فلسطینی اتھارٹی بھی حماس کو اپنے اقتدار کے لیے ایک بڑا خطرہ سمجھتی ہے۔

فروری/ مارچ ۱۹۹۶ء میں اسرائیل کے شہریوں پر دہشت گردی کی کارروائیوں کے بعد فلسطین اتھارٹی نے کئی امدادی تنظیموں پر پابندی، فنڈ روک لینے اور ساز و سامان پر قبضے کے ذریعے حماس کو مالی اعتبار سے کمزور کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، اسرائیل کی طرف سے اپنے دو شہروں ام الفہم (Um al-Fahem) اور ناصریہ (Nazareth) میں اسلامی تحریک کے خلاف جو کارروائی کی گئی تھی، اس سے بھی حماس کی سرگرمیوں اور مالی وسائل کو نقصان پہنچا۔ حماس کے امدادی ادارے یروشلم، مغربی کنارے، غزہ کی پٹی، امریکہ، سعودی عرب، عرب امارات اور ایران سمیت دنیا میں بہت سی جگہوں پر کام کر رہے ہیں۔ امدادی اداروں کا یہ جال خودکش حملہ آوروں اور قیدیوں کے خاندانوں

کی مدد کرتا ہے۔ یہ ادارے حماس کی عسکری کارروائیوں کے لیے بھی مالی امداد بہم پہنچاتے ہیں۔

دوسری بار جب انتفادہ تحریک شروع ہوئی تو اسے تزویراتی سطح پر اپنے آپ کو منظم کرنے کا ایک اور موقع مل گیا۔ اب کی بار اس نے اسرائیل کے ناجائز قبضے کے خلاف اپنی بھرپور مہم کا آغاز کر دیا اور ساتھ ہی فلسطینیوں کے قومی اتحاد کی راہ نکالنے کی تدابیر بھی شروع کر دیں۔ ستمبر ۲۰۰۰ء سے مارچ ۲۰۰۲ء تک حماس نے کم و بیش چالیس خودکش حملوں کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ ان حملوں میں ۴۰۰ سے زائد اسرائیلی شہری مارے گئے تھے۔

مختصراً، حماس، جس کے بانی اور روحانی پیشوا شیخ احمد یٰسین ہیں، کے پیش نظر پانچ واضح اہداف ہیں: پہلا اسلام سے بطور طرز زندگی ان کی وابستگی، دوسرا، ''صیہونی ریاست'' کے خاتمے کو ہی عرب اسرائیلی تنازعے کا واحد حل تصور کیا جائے۔ اس کا تیسرا ہدف اسرائیل کی جگہ فلسطینی عرب ریاست کا قیام ہے جو اس لیے ضروری ہے کہ اسرائیل مقدس اسلامی مقامات پر واقع ہے۔ چنانچہ کوئی ایسی رعایت جس سے اسرائیل کے پاس اس زمین کا ٹکڑا رہے، فلسطینی عرب مقصد سے بغاوت کے مترادف ہے۔ باقی دو اہداف میں پان اسلامی مذہبی مثالیت اور فلسطینی قوم پرستی اور اسرائیل اور فلسطین کے درمیان امن مذاکرات کی مخالفت ہے۔

فلسطینی اسلامی جہاد

حالیہ برسوں میں فلسطین اسلامی جہاد (PIJ) کی تنظیم ایک نمایاں دہشت گرد گروہ کی حیثیت سے ابھری ہے، جس نے جہاد کے تصور کو سینے سے لگایا ہوا ہے۔ یہ تنظیم اسرائیل کی ریاست کو مسلمانوں کا بدترین دشمن گردانتی ہے اور اسے تباہ کرنے کے درپے ہے۔ چنانچہ یہ تنظیم فلسطین کی آزادی کے لیے اسلامی عسکری جدوجہد کی دعوت دیتی ہے۔

اس مقصد کے لیے اس کا طریق کار یہ ہے کہ مختلف گوریلا گروپوں کو منظم کیا جائے، جن کی قیادت انقلابی دستوں کے ہاتھ میں ہو اور جو اسرائیل کو کمزور کرنے کے لیے دہشت گرد حملے کریں۔ فلسطینی اسلامی جہاد کے افراد کا خیال ہے کہ وہ اس دن کی تیاری کے لیے بنیادیں ڈال رہے ہیں جب ایک عظیم

اسلامی فوج جنگ کے میدان میں اسرائیل کو تباہ کر دے گی۔ اس تنظیم نے ۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۰ء کے درمیان اسرائیل میں متعدد تباہ کن خودکش حملے کیے ہیں۔ مصر کی تنظیم اخوان المسلمون سے علیحدہ ہونے والے فلسطینی طلبہ نے ۸۰-۱۹۷۹ء میں غزہ کی پٹی میں فلسطینی اسلامی جہاد کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کے بانی ایران میں اسلامی انقلاب اور مصر کی طلبہ تنظیموں کی انتہا پسندی اور عسکریت پسندی سے متاثر تھے۔ اس تحریک کے پرجوش قائدین فتحی الشقیقی، عبدالعزیز عودہ اور بشیر موسیٰ کو اس بات پر تشویش تھی کہ اخوان المسلمین تحریک، مسئلہ فلسطین پر خاموشی کیوں اختیار کیے ہوئے تھی اور فلسطینی ریاست کے قیام میں کسی سرگرمی کا مظاہرہ کیوں نہیں کر رہی تھی۔ اس حوالے سے انہوں نے ایک متبادل نظریہ پیش کیا جس نے آگے چل کر ایک نئی تنظیم کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ اس تنظیم کی مرکزی سوچ کچھ یوں تھی کہ اسلامی دنیا کا اتحاد فلسطین کی آزادی کے لیے پیشگی شرط نہیں ہے، بلکہ فلسطین کی آزادی اسلامی دنیا کے اتحاد کا باعث بن سکتی ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اسلامی تنظیموں کا جہاد فلسطین کو آزاد کرانے اور ایک مربوط اسلامی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

فلسطینی اسلامی جہاد نے فلسطینیوں کو ایک ایسی انتظامی چھتری فراہم کر دی، جس کے سائے تلے کئی بنیاد پرست مسلم گروہ جمع ہو گئے ہیں۔ یہ گروہ اپنی کارروائیاں الگ الگ سرانجام دیتے ہیں لیکن ایران کی اسلامی ریاست اور اس کے اسلامی قانون کے نفاذ کے مقصد کے ساتھ وفاداری اور عقیدت مندی رکھتے ہیں۔ فلسطینی اسلامی جہاد کا شمار مشرقِ وسطیٰ کی شدید انتہا پسند اور متشدد اسلامی تنظیموں میں کیا جاتا ہے۔

جون ۱۹۸۷ء میں انتفادہ کے آغاز سے ہی فلسطینی اسلامی جہاد نے اس میں شدت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ پہلی انتہا پسند تنظیم تھی جس نے عمومی ہڑتالوں اور مظاہروں کا آغاز کیا۔ مقبول متشدد تحریک کی قیادت کرنے کی کوششیں اس وقت دم توڑ گئیں جب ۱۹۸۸ء کے وسط میں اس کے قائدین کو گرفتار کر کے ملک بدر کر دیا گیا اور غزہ میں ان کی متبادل قیادت کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

اطلاعات ملی ہیں کہ اسلامی جہاد کو شام کی خفیہ ایجنسیوں نے دہشت گرد حملے کرانے کے لیے استعمال کیا۔ لبنان کے اخبارات میں ایسی خبریں شائع ہوئیں جن سے لبنان میں موجود ایران کی مدد یافتہ

''حزب اللہ'' کے ساتھ بھی اسلامی جہاد کے رابطوں کا انکشاف ہوا۔ یقین کیا جاتا ہے کہ یہ تنظیمیں تربیتی مشقوں اور دہشت گردی کی وارداتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور اشتراک کرتی ہیں۔

فسطینی اسلامی جہاد نے حماس کے مقابلے میں زیادہ انتہا پسندانہ موقف اپنائے رکھا ہے تاہم یہ تنظیم بھی پی ایل او کے ساتھ مذاکرات کی حامی رہی ہے۔ ۱۹۹۳ء میں اس کے ایک لیڈر نے بیان جاری کیا تھا کہ ان کی تنظیم پی ایل او میں شمولیت اختیار کر سکتی ہے بشرطیکہ پی ایل او کی نظریاتی اور تزویراتی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ لیکن جب اسرائیل نے اس کے ۱۰۰ سے زائد اور حماس کے کئی سو کارکنان کو دسمبر ۱۹۹۳ء میں ملک سے ڈی پورٹ کر کے جنوبی لبنان بھجوا دیا تو انہوں نے اپنی یہ پیش کش واپس لے لی۔

اسرائیل اور پی ایل او کے درمیان اوسلو معاہدے کے بعد شقاقی نے اپنے سیاسی رابطوں میں اضافہ کر لیا، اور اسلامی جہاد اس معاہدے کے مخالف دہشت گرد گروپوں کے اتحاد استرداد محاذ (Rejection Front) میں شامل ہوگئی۔ اسلامی جہاد اور حماس غزہ کی پٹی میں ایک دوسرے کی مخالف تنظیمیں شمار کی جاتی تھیں۔ تاہم ۱۹۹۴ء میں فلسطینی اتھارٹی کے قیام کے بعد ان دونوں نے باہم تعاون سے دہشت گرد حملے کرنے شروع کیے۔ اسرائیلی ایجنٹوں پر اکتوبر ۱۹۹۵ء میں شقاقی کو مالٹا میں قتل کرنے کا الزام لگایا گیا۔ ان کی جگہ لینے والے ڈاکٹر رمضان عبداللہ سلاح فلوریڈا میں کئی سال مقیم رہے اور ۱۹۹۶ء کے آغاز میں دمشق منتقل ہو گئے۔ شخصی طور پر وہ تنظیم پر شقاقی کی طرح اپنا اثر زیادہ نہ ڈال سکے۔

۱۹۸۰ء کے اواخر میں جب حماس نے خودکش حملے کرنے شروع کیے تو دونوں تنظیموں نے دہشت گردی کی کارروائیوں میں انتظامی تعاون کا سلسلہ مضبوط کیا۔ امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی بھرپور مدد کی بنا پر وہ بھی اسلامی جہاد کا ہدف بن گیا ہے۔ جولائی ۲۰۰۰ء میں اسلامی جہاد نے دھمکی دی کہ اگر امریکی ایمبیسی کو تل ابیب سے یروشلم منتقل کیا گیا تو وہ امریکی مفادات پر حملے کریں گے۔

انتفادہ کا دوسرا دور شروع ہونے سے لے کر اب تک فلسطینی اسلامی جہاد، حماس کے ساتھ متعدد خودکش بم حملوں میں شریک ہو چکی ہے۔ ان کارروائیوں کے ردعمل میں اپریشن ڈیفنسیو وال (Operation Defensive Wall) کے حوالے سے اسرائیل نے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں

فلسطینیوں کے نیٹ ورک کو توڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس دوران فلسطینی اتھارٹی اور فلسطینی مذہبی دہشت گرد گروہوں کے رابطوں پر بھی کچھ نئی چیزیں سامنے آئیں۔ اسرائیلی دفاعی اداروں نے فلسطینی اتھارٹی کے حماس اور اسلامی جہاد دونوں سے رابطوں کے بارے میں کچھ دستاویزات تلاش کر لیں۔ اسرائیل میں بڑے پیمانے پر خودکش حملوں کی کارروائیوں میں تعاون بھی سامنے آیا۔ ایک مثال ۲۷ نومبر ۲۰۰۱ء کو افولا (Afula) میں اسلامی جہاد کا خودکش بم دھماکہ ہے۔ فلسطینی اتھارٹی کے جاسوسی کے نظام نے اسلامی جہاد کو نہ صرف معلومات فراہم کیں بلکہ اسلحہ بھی سپلائی کیا۔ مختصراً اسلامی جہاد کی نظریاتی سوچ تین بنیادی اصولوں پر مبنی ہے۔ اول، اسرائیل کی ریاست کو دہشت گردی کے ذریعے ختم کر دیا جائے۔ دوم، ایسی عرب مملکتوں کا بھی تختہ الٹ دیا جائے جو اسلامی قانون نافذ کرنے میں مخلص دکھائی نہ دیتی ہوں۔ اور سوم، پی ایل او کو اس بنا پر شدید تنقید کا نشانہ بنایا جائے کہ اس نے اسرائیل سے مفاہمت کرنے اور فلسطینیوں کے حقوق کو پس پشت ڈالنے کی جسارت کی تھی۔ فلسطینی اسلامی جہاد کے بقول پی ایل او کے اس تعاون سے فلسطین کی تحریک مزاحمت کو دھچکا لگا ہے۔

حاصل کلام

جولائی ۲۰۰۲ء میں صدر کلنٹن نے کیمپ ڈیوڈ میں ایک مشرق وسطی امن کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔ بدقسمتی سے فلسطین اتھارٹی کے چیئرمین یاسر عرفات نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا تھا۔ انکار کی وجہ یہ تھی کہ یاسر عرفات تشدد کی راہ اختیار کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ نئے انتفادہ کے آغاز کے دو سال بعد فلسطینی اتھارٹی کے تعاون سے دہشت گردی کی کارروائیوں کی لہر میں شدت آئی ہے۔ دہشت گردی کے پھیلاؤ میں ایک اہم عنصر حماس اور فلسطینی اسلامی جہاد جیسی اسلامی تنظیموں کا تباہ کن کردار ہے۔

دہشت گردی کو اسلامی جہاد کے روپ میں پیش کرنے کا اندازہ اس اعلامیہ سے لگایا جا سکتا ہے، جو جنوری ۲۰۰۲ء میں بیروت میں جاری کیا گیا تھا۔ اس دینی اجتماع میں حماس اور فلسطینی اسلامی جہاد کے نمائندے شریک ہوئے تھے اور حزب اللہ نے اس کانفرنس کی میزبانی کے فرائض سرانجام دیے تھے۔ اس کانفرنس میں لبنان، فلسطین اتھارٹی، سوڈان، متحدہ عرب امارات، مراکش، الجزائر اور اردن کے متعدد

دینی سکالر شامل ہوئے تھے۔ مندوبین نے اسرائیل کے خلاف خودکش حملوں کے حق میں فتویٰ دیتے ہوئے انہیں قران کی رو سے جائز قرار دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ خودکش حملے ایک ایسا تزویراتی ہتھیار ہیں جو صیہونیت سے نمٹنے کے لیے اپنے پیروکاروں کو ہر لحظہ سرگرم عمل رکھتا ہے۔

مذہب کو عربوں کی سیاسی ضروریات کے تحت استعمال کرنا مشرق وسطیٰ میں خطرے کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔ حماس اور فلسطینی اسلامی جہاد نے بہت احتیاط اور بڑے منظم طریقے سے تسلسل کے ساتھ اپنا پیغام ملک میں اور بیرونِ ملک اپنے مخصوص مخاطبین کو مذہبی دعویٰ پارسائی کے ساتھ پہنچایا ہے، جو قوم پرستی کی ہی ایک شکل ہے۔ قومیت پرستی کے جذبے کو اب مذہبی تقدس کا رنگ دے دیا گیا ہے اور اسلام کی ایسی تعبیر پیش کی گئی ہے جس سے اسرائیل کے وجود کی نفی ہوتی ہے اور دہشت گردوں کے موقف کو تقویت ملتی ہے۔

فلسطین کی مزاحمتی تحریک کو جہاد کے قالب میں منتقل کرنا کوئی پسندیدہ عمل نہیں۔ فلسطین کا تنازعہ خالص ایک سیاسی تنازعہ ہے اور اسے اسی تناظر میں حل ہونا چاہیے۔ اس مسئلہ کو مذہبی رنگ دے کر اسرائیل کے خلاف مسلمانوں کے جذبات کو ابھارنا، انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔ حماس اور پی آئی جے نے دہشت گردی کو ہوا دینے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اس سے علاقائی سطح پر اور عالمی سطح پر امن کی قوتوں کو دھچکا لگا ہے۔ امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جو جنگ بپا کر رکھی ہے، اسے مشرق وسطیٰ میں بھی جاری رہنا چاہیے اور جو قوتیں اس خطے کے امن کو تہ و بالا کر رہی ہیں، ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جانی چاہیے۔

[یوناہ الیگزینڈر پوتومیک انسٹی ٹیوٹ فار پالیسی اسٹڈیز کے "بین الجامعات مرکز برائے مطالعات دہشت گردی" کے ڈائریکٹر ہیں۔ آپ درج ذیل کتاب سمیت بین الاقوامی تعلقات اور دہشت گردی کے موضوع پر تقریباً ۹۰ کتابوں کے مصنف بھی ہیں: *Combating Terrorism: Strategies of Ten Countries*, University of Michigan Press, 2002.]

قتل بذریعہ خودکشی—تاریخ اسلام سے ماخوذ واقعات

مصنف: کیرن اندریالو

ترجمہ: پروفیسر نیاز عرفان*

فلسطینی خودکش بم بازوں کے ہاتھوں عالمی تجارتی مرکز کی تباہی اور لبنان میں امریکی اہداف اور اسرائیلی تنصیبات کے خلاف کمانڈو کارروائیوں کے نتیجے میں، اب ہم "قتل بذریعہ خودکشی" کے مظہر سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ اگرچہ ایسی تنظیموں میں جو سیاسی تشدد کے لیے ذاتی قربانی کی خاطر اپنے ارکان کی بھرتی، تربیت اور تفویض کار میں ملوث ہیں، مسلمانوں کے گروہوں کی نمائندگی نمایاں ہے، تاہم اس کام میں وہ تنہا نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر سری لنکا میں ہندو تنظیم تامل ٹائیگرز نے ایسی ہی خودکش کارروائیوں کے ذریعے بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی اور سری لنکا کے صدر رانا سنگھے پریماداسا سمیت متعدد سربرآوردہ سیاست دانوں کو قتل کیا ہے۔

اس قسم کی کارروائیوں میں خودکشی بہت نمایاں عنصر ہے جس کا تعلق کسی گروہ اور اس کے پروگرام سے ہوتا ہے اور اس کا محرک، منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد اسی گروہ کے تنظیمی ڈھانچے کے تحت ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے خاتمے کا انتہائی ذاتی، انفرادی اور جرأت مندانہ عمل متشددانہ شناخت کی طالب نظریاتی تحریک کے طبل جنگ کی تال پر آگے بڑھتا ہے۔ اگرچہ شہید اور تحریک کے مابین اشتراک عملاً بے جوڑ نظر آتا ہے، تاہم یہ انتہائی صورتوں میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اور اس کی کامیابی کی شرائط ضروری نہیں کہ عمومی سماجی عمل کی ضروریات سے مطابقت رکھتی ہوں۔ قتل بذریعہ خودکشی کرنے والے کے عمل میں اپنی مرضی بھی شامل ہوتی ہے اور اس تحریک کی مرضی بھی شامل ہوتی ہے جس سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ شہادت کے لیے ضروری ہے کہ شہید اس کا انتخاب آزادانہ کرے لیکن اس کا مطمح نظر اپنی تنظیم کے اہداف کا حصول بھی ہوتا

* Karin Andriolo, "Murder by Suicide: Epicodes from Muslim History", *American Anthropologist*, Washington, Sep-2002, pp. 736-742.

ہے۔ دراصل جب تنظیم کی مرضی شہید کی اپنی مرضی بن جاتی ہے تو یہ فعل سرزد ہوتا ہے۔

ذیل میں تاریخ اسلام سے لی گئی تین مثالوں سے قتل بذریعہ خودکشی کے مرتکب ''شہیدوں'' اور ان کی تنظیموں کے اہداف کی یکجائی اس عمل کی تصویرکشی اور اس کے مذہبی عباداتی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

حشیشین (ASSASSINS)

قتل بذریعہ خودکشی کے عمل کی ایک بدنام زمانہ مثال ''نظاری ریاست'' میں ملتی ہے جو گیارہویں سے تیرہویں صدی عیسوی کے دوران شام اور ایران میں قائم پہاڑی قلعوں پر مشتمل تھی جو آپس میں کسی حد تک مربوط تھے۔ شامی حشیشین کے بارے میں حقائق اور افسانے یورپ میں مشرق وسطیٰ سے واپس جانے والے صلیبی سپاہیوں کے ذریعے پہنچے اور وہاں یہ اصطلاح رائج ہوگئی۔ مارکو پولو جیسے ان سیاحوں نے، جنہوں نے مشرق بعید کے سفر اختیار کیے، ایرانی نظاریوں کی اس بنتی ہوئی تصویر میں مقامی طور پر رائج قصے کہانیوں سے مزید رنگ بھرا۔ مسلمانوں کے ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کو شامل کر کے جدید دور کے محققین نے مستند تاریخی حقائق کو ظن وتخمین کی آلائش سے پاک کر دیا ہے۔ زیرنظر تحریر میں ان دونوں ذرائع سے استفادہ کیا گیا ہے۔

نظاری ریاست میں شیعوں کی ایک اقلیم تھی اور یہ ان چند ایک مقامات میں سے تھی جہاں ان کو سیاسی اقتدار حاصل ہوا۔ مشرق وسطیٰ میں سُنی حکومتوں کے خاتمے کے لیے (شیعہ) نوجوانوں کا ایک لشکر تیار کر کے ان کی تربیت کی جاتی تھی اور ان کو سنی مقتدرہ میں سے سربرآوردہ حکام کو قتل کرنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ عموماً ان نوجوانوں کا تعلق دیہی علاقے سے ہوتا تھا جنہیں اسلحہ کے استعمال کی وسیع پیمانے پر تربیت دینے کی غرض سے ایک قلعے میں لے جایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں مختلف زبانیں اور وہ معلومات اور مہارتیں بھی سکھائی جاتی تھیں جن کی مدد سے بعدازاں انہیں مختلف بھیس بدلنے میں سہولت ہوسکتی تھی تاکہ وہ پکڑے نہ جاسکیں۔ ان کا مشن یہ ہوتا تھا کہ وہ اعلیٰ مرتبے پر فائز اور ہر قسم کے حفاظتی انتظامات میں رہنے والی اپنی شکار شخصیت سے اتنی قربت حاصل کرلیں تاکہ اسے بہ آسانی خنجر کے وار سے قتل کرسکیں۔ اکثر ان کے مشن میں یہ بات بھی شامل ہوتی تھی کہ وہ دھیرے دھیرے اپنے ہدف شخص سے ہم رازی کے مرتبے پر

فائز ہو جائیں اور بعض اوقات ایک ہی شکار کے پیچھے کئی قاتلوں کو لگا دیا جاتا تھا۔ حشیشین اپنی زندگی کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے، اور اپنے شکار کے ساتھ مر جانے کو باعث افتخار سمجھتے تھے۔

اپنے دو سو سال سے زائد عہدِ حکومت کے دوران نظاریوں نے اپنے واضح اور غیر مبدل اہداف اور تزاویہ کو جاری رکھا۔ ان کی ترجیح یہ ہوتی تھی کہ مضبوط اور محفوظ صاحب اختیار (سنی) شخصیت کو میدان جنگ کی بجائے تنہا ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ جنگ کے لیے بڑی طاقت کی حامل حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حشیشین کے ''عمل جراحی'' کے ذریعے (سنی) قائدین کا خاتمہ کیا جاتا اور افراتفری، خوف و ہراس کی فضا اور تعلقات میں تبدیلی پیدا کی جاتی۔ ان کے ارادے بہت بلند تھے، وہ دو خلفاء اور متعدد وزراء، سلاطین، امراء، منتظمین، منصفین اور علمائے دین کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ البتہ وہ اپنے سب سے بلند مرتبہ شکار صلاح الدین ایوبی کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب نہ ہو سکے جو ان کے دو قاتلانہ حملوں میں بچ نکلے۔ البتہ صلاح الدین ایوبی نے غالباً اس بات کا شبہ ہو جانے پر کہ ان کے دو نہایت قابل اعتماد محافظ دراصل ان کے قتل پر مامور حشیشین ہیں، شامی نظاریوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے احتراز کرنا مناسب جانا۔ (یہ عجیب و غریب قصہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، البتہ ان پر دو حملوں کی بات سچ ہے۔)

حشیشین نے، جن کو بعض روایات کی رو سے فدائین بھی کہا جاتا ہے، تکنیکی اور نفسیاتی لحاظ سے اپنے طریقہ واردات کو بتدریج بہت موثر بنا لیا تھا۔ ایک ایسے خودکش قاتل کا جو اپنی بقا کی امید یا منصوبے کی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتا، اپنے مفوضہ فریضے کی ادائیگی میں کامیابی کا زیادہ امکان ہوتا ہے کیونکہ وہ اس میں زیادہ مہارت، جوش و جذبے اور تنوع و جدت سے کام لیتا ہے۔ علاوہ ازیں حشیشین کی اپنی زندگی سے بے اعتنائی کی بنا پر اس امر کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا تھا کہ کوئی شخص ان پر دھمکیوں سے یا لالچ سے اثر انداز ہو سکتا تھا۔ یقینی موت انہیں ناقابل رسائی بنا دیتی تھی۔ لوگ ان سے خوفزدہ تو ہوتے تھے لیکن ان سے بچنے کی کوئی صورت نہ پاتے تھے۔

نظاریوں کا تعلق شیعوں کے اسماعیلی ذیلی اقلیتی فرقے سے تھا۔ وہ اپنے اہداف ہزار سالہ پروگرام کی زبان میں بیان کرتے تھے جس کا مطمع نظر سنی حاکمیت، جسے وہ باطل قرار دیتے تھے، کا خاتمہ اور (بزعم خود) عدل و انصاف کی بالادستی تھا۔ وہ اپنے اخلاقی و دینی مشن کی نجابت کے تصور کو اپنے نوجوانوں کے

ذہن میں جاگزیں کرتے تھے اور رسوم کی ادائیگی کے ذریعے اس کو مہمیز دیتے رہتے تھے۔ قتل کے عمل کو بھی ایک رسم کا روپ دے دیا گیا تھا جسے تقریباً تقدیس کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اس عمل میں صرف خنجر کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اگرچہ بعض اوقات قتل کے دیگر ذرائع کارکردگی میں بہتر ثابت ہو سکتے تھے۔ یہ وہ خاص خنجر ہوتا تھا جو نظاری رہنما منتخب کردہ شخص کو مشن کی انجام دہی کی خاطر بھیجنے کے موقع پر ایک خاص رسم کی ادائیگی کے بعد حوالے کرتا تھا۔

ان تمام کارروائیوں کے بعد بھی نظاری تحریک سنی اقتدار کا خاتمہ نہ کر سکی اور بعد میں، تیرہویں صدی میں منگولوں نے مشرق وسطیٰ کے نقشے کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ تاہم ان کے سیاسی تشدد کی منصوبہ بندی، نظم و ضبط اور دورانیہ کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

نظاریوں کے بارے میں جو قصے عیسائیوں کے ہاں مشہور ہیں ان کے لیے تاریخی ثبوت کی کمی ہے۔ ان کے ہاں زیادہ تر سنی سنائی باتیں رائج رہی ہیں۔ ان سے اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ وہ کیا چیز تھی جس کی بنا پر فدائین اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اتنے عزم صمیم کے ساتھ اپنا مفوضہ فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ ابتدائی ماخذ میں جنت کے وعدے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بات اس اسلامی عقیدے سے مطابقت رکھتی ہے کہ جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں وہ جہنم میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کیے بغیر سیدھے جنت میں جائیں گے۔ اس اندھی عقیدت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ جو فدائین کو اپنے تنظیمی آقا سے ہوتی تھی۔ یہ اندھی عقیدت پہاڑی قلعے کی تنہائیوں میں رہائش اور تربیت کے دوران پیدا کی جاتی تھی۔ اگر کسی فدائی کا آقا محض آزمائش کے لیے بھی اسے ایسا کرنے کو کہتا تو وہ بلندی سے چھلانگ لگا کر جان پر کھیل جانے سے بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔

اس بنا پر کہ شہداء اور پیغمبروں کے لیے مخصوص بہشت کے باغ میں داخلے کے لیے آقا کی مدد درکار ہے، آقا سے فدائی کی کلی وفاداری اور فدائی کی جنت میں یقینی داخلے کی آرزو دونوں باہم مل کر (قتل بذریعہ خودکشی کا) محرک بن جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں آقا نوجوان فدائیوں کی اس مقام مسرت یعنی بہشت میں داخلے کی خواہش سے مخصوص کام لینے کے لیے مشکوک قسم کے طریقے استعمال کرتا ہے۔ ایران میں سفر کے دوران مارکوپولو نے اس قسم کے قصے سنے تھے کہ پہاڑی قلعے میں ایک خوبصورت خفیہ باغ بنایا گیا

ہے جس میں ہر قسم کی عیش و عشرت فراہم کرنے کے ماہر لوگ مقرر کیے گئے ہیں۔ وقتاً فوقتاً فدائین کو حشیش یعنی بھنگ سے مدہوش کر کے اس باغ میں پہنچا دیا جاتا ہے، جسے فدائین جنت سمجھتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد انہیں حشیش سے مدہوش کر کے وہاں سے نکال دیا جاتا ہے۔ یوں وہ اس عیش و عشرت کے عادی ہو جاتے ہیں جس کے دوامی طور پر اور فوری حصول کے لیے وہ اپنی جان نثار کر کے مفوضہ قتل کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے آقا کے بارے میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ اسی کے حکم سے جنت کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ اس قصے کا تانا بانا بہت رنگین اور پُر تاثیر ہے لیکن یہ فدائین کی حشیش استعمال کرنے کی عادت کی افواہوں کی مانند (جس کی بنا پر ان کا یہ نام پڑا) ثبوت سے عاری ہے۔

یہ قصے حقیقت ہیں یا محض ذہنی اختراع، اس سے ہمیں غرض نہیں۔ بہرصورت ان سے ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خودکشی پر منتج ہونے والے کام کی ذمہ داری سر لینے میں بہشت کے وعدے میں بڑی کشش ہونا قرینِ قیاس ہے تاہم خوفناک موت، معلوم دنیا کو چھوڑنے اور اس دنیا اور اگلی زندگی کے درمیان کی تاریک گلی میں داخل ہونے کے امکان کی ہیبت کو بے اثر کرنے کی خاطر مزید انعامات بھی ضروری ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی شعبدہ بازیوں سے، جو حشیشین کو تربیت دیتے تھے، اس عقیدے کی کچھ گرہ کشائی ہوتی ہے۔ فدائین کے کئی مواقع پر فریب آمیز جنت ارضی میں منتقل ہونے اور وہاں سے واپسی کے تجربے سے وہ زندگی سے موت کی حالت میں انتقال کے ذائقے سے تمثیلی طور پر آشنائی حاصل کر لیتے تھے۔ کیونکہ ایسے سابقہ تجربے کے بغیر، جس میں نامعلوم کی بیکراں اور مہیب وسعت کا پہلے ہی کئی دفعہ تجربہ کیا جا چکا ہوتا تھا، فدائی بننا ناقابلِ تصور حد تک ہیبت ناک محسوس ہوتا۔ حشیشین کو امید ہوتی تھی کہ وہ جانا پہچانا بہشت کا دربان (یعنی روحانی آقا) جو پہلے بھی سفرِ آخرت کو آسان بنانے میں نگران رہنما کا کردار ادا کرتا تھا وہ آخری بار بھی ایسا ہی کرے گا۔ بہشت کے عیش و عشرت کو حقیقت کا رنگ دے دینا ایک مفید ترکیب ہوتی تھی تاہم انتقال کے موقع کی ذہنی کربناک کیفیت کی شدت کو ختم کرنے کا کام ایک اعلیٰ ذہانت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔

یوں حشیشین کے بارے میں قدیم قصوں سے پتہ چلتا ہے کہ قتل بذریعہ خودکشی کے قواعد کا مقصد موت کے خوف کا خاتمہ ہوتا تھا۔ مسلمانوں میں شہادت کی مختلف مثالوں میں یہی مقصد کارفرما نظر آتا ہے،

تاکہ موت اور بہشت میں داخلے کا وقفہ، جو کہ بڑی ہیبت اور خوف کا باعث ہے، سکڑ کر صفر بن جائے۔ اس وقفے یعنی عالم برزخ کے دورانیے کو کم کرنے سے متعلق روایتی مسلم تصور ایک اڑتے ہوئے سفید گھوڑے سے وابستہ ہے، جو شہید کو لے کر فوراً جنت میں پہنچا دیتا ہے۔ آج کل ''اڑن گھوڑے'' کا یہ تصور ختم ہو گیا ہے۔ فلسطینی ''خودکش بمباز'' سبز پرندے'' کی علامت پسند کرتے ہیں جسے جامنی رنگ کے پس منظر پر دکھایا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام کے قول کے مطابق ''یہ سبز پرندہ جنت کا پرندہ ہوتا ہے جو شہید کی روح کو فوراً اللہ میاں کے پاس پہنچا دیتا ہے''۔

ناصرہ حسن نے غزہ میں ۱۹۹۶ء اور ۱۹۹۹ء کے درمیانی عرصے میں ایسے لوگوں سے متعدد انٹرویو کیے، جو شہادت کے مشن پر جانے کا انتظار کر رہے تھے یا جو اپنے مفوضہ فریضے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے، اور ان کے ساتھ بھی انٹرویو کیے تھے جو ایسے نوجوانوں کو تربیت دیتے ہیں۔ وہ تمام اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شہادت کے خواہش مند کو لازماً بہشت کو توجہ کا مرکز بنانا ہوتا ہے، انہیں داخلی طور پر اس کا تخیل حاصل ہونا چاہیے اور اپنے بارے میں یہ محسوس کرنا چاہیے کہ وہ محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] اور اللہ کے حضور حاضر ہیں۔ بالخصوص کارروائی سے پیشتر آخر چند دنوں میں انہیں لازماً فوری طور پر اس میں داخل ہونے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ فوری انتقال کی رفتار میں سرعت پیدا کر کے زندگی کی حالت سے موت کی حالت میں جانے کے کرب پر فتح پانے کی تفصیل ایک ایسے شخص نے بیان کی ہے جو اپنے مشن کی انجام دہی سے پیشتر گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ کہتا ہے'' (بہشت) بہت ہی نزدیک ہے، عین آنکھوں کے سامنے بس یوں سمجھیے کہ انگوٹھے کے نیچے پڑی ہوئی ہے۔ گویا دھماکا خیز مواد کے دوسری طرف''۔

ایران-عراق جنگ کے دوران شہیدوں کی سواری کے لیے یقیناً ایسے گھوڑے اور پرندے کم پڑ گئے ہوں گے، جب آیت اللہ خمینی نے ۱۲ سال کی عمر سے زائد لڑکوں کو، حتیٰ کہ والدین کی اجازت کے بغیر بھی، ورغلا کر فوج میں بھرتی کر لیا تھا۔ میدان جنگ میں ان (بچوں) نے سپاہیوں سے آگے آگے بھاگتے ہوئے بارودی سرنگوں کے دھماکے کر دیے اور ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے۔ انہیں بلاتاخیر بہشت میں داخلے کے لیے تائیوان کی ساختہ پلاسٹک کی بنی چابیاں جاری کی گئی تھیں۔

فلپائن میں رسم حلف برائے خودکشی (Juramentado)

نسلی بنیادوں پر قتل بذریعہ خودکشی کی وارداتوں کی دوسری قسم وہ ہے جو فلپائن میں مسلم اقلیت میں پائی جاتی ہے۔ وہاں قتل بذریعہ خودکشی کی بہت منظم شکل پائی جاتی ہے جس کے ساتھ ساتھ اس کی متضاد شکل یعنی خودکشی بذریعہ قتل بھی موجود ہے۔

سولھویں صدی عیسوی میں فلپائن میں اسلام تیزی سے پھیلا اور اس نے ہندومت و بدھ مت نیز دیگر مقامی مذاہب کی جگہ لے لی۔ لیکن جلد ہی ہسپانوی راج اور عیسائیت کے کیتھولک فرقے کی توسیع سے اشاعت اسلام کی رفتار میں کمی آ گئی۔ اور صرف جنوبی جزائر سولو (Sulu Archipelago) میں چند مختلف نسلوں کے قبائل دین اسلام سے وابستہ رہے۔ انہیں ہسپانیوں نے ''مورو'' کا نام دیا جنھوں نے تین سو سالہ ہسپانوی نوآبادیاتی راج کے دوران مختلف مقامات پر جتھے بنا کر مزاحمت جاری رکھی۔

فلپائنی مسلمانوں نے عیسائیوں کے خلاف جن سے وہ نفرت کرتے تھے دو قسم کے خودکش حملے شروع کر دیے۔ میدان جنگ میں ہسپانوی فوج سے لڑائی میں بعض آدمی رضا کارانہ طور پر اگلی صفوں میں تعیناتی کرواتے اور اندھا دھند دشمن کی صفوں میں گھس کر حملہ آور ہوتے اور بے جگری سے لڑتے رہتے حتیٰ کہ مارے جاتے۔ اس جہاد کی ایک اور شکل یہ تھی کوئی شخص تنہا ''کرس'' نامی خنجر سے یا بعض اوقات چھوٹے نیزے سے مسلح ہو کر کسی عیسائی بستی میں گھس جاتا اور جو کوئی بھی راستے میں آتا اس پر حملہ کر دیتا۔ بعض اوقات غیر عیسائی لوگوں، عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس سے پیشتر کہ بالآخر کوئی اسے قتل کر دیتا اس کے زوردار اچانک اور اندھا دھند حملے سے کئی لوگ ڈھیر ہو چکے ہوتے۔ کبھی کبھار اس قسم کی مار دھاڑ کے لیے کئی لوگ پیشگی معاہدہ کر لیتے تھے۔

خودکش حملہ ایک قدیم عمل کا آخری جزو ہوتا تھا جسے مقامی زبان میں کئی ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ ہسپانوی زبان میں اسے جیورامنٹاڈو (Juramentado) کا نام دیا جاتا تھا، جس کا مطلب ہے ''قسم کھا کر حلف اٹھانا''۔ جو شخص قسم کھا کر حلف اٹھاتا تھا، وہ پہلے اس کے لیے اپنے والدین سے اور بعد ازاں مقامی یا اعلیٰ تر صاحب اختیار ہستی سے اجازت لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے ہتھیاروں کی طرف متوجہ ہوتا اور پھر رسمی تیاریوں کے ایک سلسلے میں مشغول ہو جاتا۔ اس میں طہارت، غسل اور دعا شامل ہوتی کہ یہی

میت کے دفن کرنے سے پہلے کیا جاتا ہے۔ یہ کام اس کی زندگی میں ہی کر لیا جاتا تھا کیونکہ مرنے کے بعد اس کی لاش کے ملنے کا امکان نہ ہوتا تھا۔ اس کی جسمانی طاقت اور قوت برداشت بڑھانے کی خاطر کچھ اور عمل بھی کیے جاتے تھے، جن میں تعویذ باندھنا، خوشبو لگانا، اس کے سر کی حجامت اور بھنویں اکھاڑ دینا، اور ذکر کو اوپر کی طرف کس کر باندھ دینا شامل تھے۔

متعلقہ شخص کو قتل و غارت کے لیے درکار ضروری ساز و سامان مثلاً ہتھیاروں کے استعمال میں سہولت، تشدد کا رجحان اور مزعومہ ناانصافیوں کے ازالے کے لیے جوش و جذبہ، اسے اس کا تمدن فراہم کر دیتا تھا۔ تھامس کیفر نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں طاؤسغ نامی قبیلے میں رہ کر تحقیقی کام کیا تھا جو کہ سولو کے جزیروں میں رہنے والا ایک بڑا نسلی گروہ ہے۔ اس کی تحقیق کے مطابق چھوٹی سے چھوٹی چوری، کسی نازیبا جملے، تحقیر آمیز نظر سے دیکھنے یا وقت مقررہ پر قرض کی عدم ادائیگی پر، یعنی کسی بھی بات پر تشدد پھوٹ سکتا ہے۔ اور پھر جلد ہی مردوں میں قتل و غارت شروع ہو جاتی کیونکہ ان لوگوں کے معمول کے لباس میں گولیوں کی پیٹی، ایک رائفل اور تیز دھار ہتھیار شامل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی توہین کا بدلہ نہ لے تو یہ اس کے لیے باعث شرم بات ہوتی ہے اور ہر موت کا انتقام لیا جانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قسم کھا کر حلف اٹھانے (Juramintado) کے بارے میں رپورٹیں بہت کم ہیں اور وہ بنیادی باتوں تک محدود ہیں۔ ان میں رسموں کے تسلسل اور ترکیبی عقائد جن کی جڑیں راسخ العقیدہ اسلام میں قائم ہیں اور جن میں مقامی تصورات کا امتزاج ہو گیا ہے، کے لحاظ سے اتفاق پایا جاتا ہے۔ ان کے عقیدے کی رُو سے قسم کھا کر حلف اٹھا کر شہادت پانے والا شخص سفید اڑن گھوڑے پر بیٹھ کر بہشت میں پہنچ جاتا ہے اور اسے ماضی کے گناہوں کے لیے جہنم میں رہ کر کفارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بات اس عقیدے پر مبنی ہوتی ہے کہ وہ ''معصوم موت'' مرا ہوتا ہے، جس کا مطلب باطل پرست دشمن کے ہاتھوں موت ہے۔ چونکہ ہسپانوی جبری مذہب تبدیل کرواتے تھے، اس لیے وہی باطل پرست دشمن تصور کیے جاتے تھے۔ جب ایک دفعہ ۱۸۹۸ء میں ہسپانیوں کو شکست ہو گئی اس کے بعد نہ تو امریکی اور نہ ہی فلپائنی دشمنانِ اسلام کے کردار میں نظر آئے اور حلف برائے خودکشی کی کثرت وقوع میں کمی آ گئی۔ بعد میں جا کر کچھ مدت کے لیے جاپانی اور ماضی قریب میں اکا دکا فلپائنی سپاہی اس کا نشانہ بنے۔

حلف برائے خودکشی ساخت کے لحاظ سے کئی پہلوؤں میں حشیشین کی کارروائیوں سے مختلف ہے۔ اسے اوپر سے کوئی ایسا مقتدر ترین رہبر ترتیب نہیں دیتا جس کی تنظیم کے بھرتی شدہ پیروکار اس سے بلا شرکت غیرے وفاداری کے رشتے میں جکڑے ہوئے ہوں۔ وہ پیروکار جن کی تنہائی میں اس وقت تک تربیت اور تلقین عقیدہ جاری رہتی ہو جب تک کہ انہیں کوئی مشن تفویض نہیں ہو جاتا۔ جبکہ خودکشی کا حلف اٹھانے والا شخص کسی گاؤں میں عام سی زندگی بسر کرتے ہوئے اپنی مرضی سے اور خود منتخب کردہ وقت پر اس کام کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی کارروائی غیر معمولی نوعیت کی ہوتی ہے، تاہم وہ سب سے الگ تھلگ کوئی ایسا مصروفِ عمل شخص نہیں ہوتا جو اپنی برادری سے بالکل ہی لاتعلق ہو۔ اپنی جدوجہد کی راہ میں اس کا پہلا قدم اپنے والدین، میر دیہہ، قریبی رشتہ داروں اور بعض اوقات سلطان کے پاس حاضری دینا ہوتا ہے، سلطان کے پاس اس لیے کہ وہ ہسپانوی راج کے دوران مجمع الجزائر سولو میں مسلمانوں کی برادری کا بیک وقت انتظامی اور مذہبی سربراہ ہوتا تھا۔ وہ ان سب کے سامنے الگ الگ اپنے ارادے کا اظہار کرتا۔ وہ اس کو اس کام کی اجازت دیتے کیونکہ محلف جو کام کرنے جارہا ہوتا وہی کام وہ خود، ان کا کوئی بیٹا، کوئی رشتہ دار، کوئی دوسرا دینی بھائی یا کوئی بھی مسلمان کرنے کو تیار ہوتا تھا۔

حلف برائے خودکشی کی جن شکلوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے —— یعنی جنگ یا تنہا ایک شخص یا کئی اشخاص کا مل کر اچانک شدید حملہ —— یہ تمام جہاد کی کارروائیاں شمار ہوتی ہیں۔ ان کارروائیوں میں جان قربان کر دینے پر اصرار اپنی انتہا پر پہنچا ہوتا ہے۔ اس کام کی مزید دو ایسی شکلیں بھی ہیں جن میں اس نمونے سے انحراف پایا جاتا ہے۔ وہ انحراف محرک کے لحاظ سے ہوتا ہے، رسمی تیاری کے طریق کار اور عمل درآمد سے نہیں۔ کوئی ایسا شخص جس سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہوا ہو اور اسے سزا تجویز کی جا چکی ہو، وہ موت کی سزا پانے کی بجائے خود رضا کارانہ طور پر یا میر دیہہ یا سلطان کی ترغیب پر اپنے آپ کو حلف برائے خودکشی کے لیے پیش کر سکتا ہے۔ حلف برائے خودکشی کی دیگر شکلوں کے مقابلے میں اس شکل میں اس قسم کی رضامندی غائب ہے کیونکہ سزا یافتہ مجرم کو صرف یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ موت کی دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کر لے۔

حلف برائے خودکشی کی دوسری شکل میں قتل بذریعہ خودکشی کی الٹ صورت نظر آتی ہے۔ ایک ایسا

شخص جو اس بنا پر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہو کہ چونکہ اس کی تحقیر کی گئی ہے، یا اپنی شادی سے ناخوش ہے یا کسی اور وجہ سے رنجیدہ ہے، حلف برائے خودکشی اٹھا سکتا ہے۔ اسلام میں خودکشی کی ممانعت ہے اور اس فعل کے مرتکب شخص کا ٹھکانہ جہنم کو قرار دیا گیا ہے۔ تاہم فلپائنی مسلمان اس فعل قبیح کو اپنی زندگی کے خاتمے کے متذکرہ بالا عسکری طریقے کے مترادف نہیں سمجھتے۔

اپنی خودکشی کو جہاد کے لبادے میں چھپانے سے نہ صرف اس پر لگا فعل شنیع ہونے کا دھبا دھل جاتا ہے بلکہ وہ قابل تحسین اور آخرت میں قابل جزا قرار پاتا ہے۔ دوسری ثقافتوں کی مانند جن میں اس قسم کی ''نقاب پوش خودکشی'' کی اجازت ہے فلپائنی مسلمانوں میں مرنے کی خواہش پنہاں نہیں ہوتی۔ یہ ایک مسلمہ عنصر ہوتا ہے جس سے اس فعل کی قدر و قیمت میں کمی نہیں ہوتی اگر چہ وہ شخص جو خودکشی بذریعہ قتل کا مرتکب ہوتا ہے جہاد کے ذرائع اور مقاصد کو الٹ دیتا ہے۔ ان میں سے بعض کو مایوسی سے نجات پانے کی خواہش اس فعل کے ارتکاب کی حد تک دھکیل دیتی ہے، دوسروں کو انتقال، عدل یا جرأت اس فعل پر اکساتی ہے۔ تاہم حلف برائے خودکشی کی رسم کی تفہیم کے لیے ہمیں داخلی تحریک کے پیچھے اس مرحلے پر نظر ڈالنا ہو گی جو ایسا حلف لینے والوں کو اس وقت درپیش ہوتا ہے جب ان کا خودکشی کرنے کا فیصلہ باطن سے ظاہر کی حد عبور کر لیتا ہے۔ والدین اور رہنماؤں پر اس فیصلے کا انکشاف اور ان کی رسمی منظوری سے داخلی عزم دنیا کے سامنے اعلان کی شکل اختیار کر لیتا ہے پھر اس اعلان پر قسم یا حلف کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔

جو شخص حلف برائے خودکشی اٹھاتا ہے وہ اپنے حلف کا پابند ہو جاتا ہے۔ اب جس بات کا خدا کی قسم کھا کر عہد کیا گیا ہے اس سے ہر گز پیچھے نہیں ہٹا جا سکتا۔ اپنی جان کی قربانی جو قسم کھانے کے وقت تک رضاکارانہ ہوتی ہے قسم کھانے پر فرضِ عین بن جاتی ہے۔ فسطینی خودکش بمبار قرآن (کریم) پر قسم کھاتے ہیں اور ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے جہازوں کے اغوا کنندگان کو ہدایت کی گئی تھی کہ آخری دن باہمی پیمان کے ذریعے اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ اپنے مشن کی انجام دہی میں اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے۔

قسم کے ذریعے پیمان کنندہ شخص اس کارنامے کے ساتھ جکڑ بند ہو جاتا ہے جس کا اس نے عہد کیا ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ کارنامہ کیا ہوتا ہے؟ خدمت اسلام کی خاطر اسے دشمنانِ اسلام سے جنگ کرنا ہوتی ہے اور انہیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں مارنا ہوتا ہے۔ شہادت کا رتبہ پانے کے لیے اسے دشمنوں کے

ہاتھوں مارا جانا ہوتا ہے۔ یوں مرنا اور مارنا ایک ہی مقصد میں مجتمع ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ مقصد ہے اور نہ ہی دوسرے کے لیے ذریعہ ہے۔ اپنے مقصد کی کامیابی کے وہ جتنا قریب ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اپنی ذات کی اور اپنے دشمن کی ہلاکت استحکام پکڑتی جاتی ہے۔ وہ جوں جوں اپنے جسم کو جہاد کے لیے جادوئی طور پر مضبوط بناتا ہے اور اسے رسمی طور پر تدفین کے لیے تیار کرتا ہے، رسمی تیاریوں کے پورے عرصے کے دوران وہ اپنی اور اپنے دشمنوں کی اموات کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے۔ مرنے مارنے کی ایک آرزو سیل رواں کی طرح اسے دشمن کے علاقے میں بہائے لیے چلی جاتی ہے۔ یہ اس منظر پر منتج ہوتی ہے جسے ذیل میں بیان کیا گیا ہے، جس سے ان کے حتمی امتزاج کا اظہار ہوتا ہے۔ چشم دید گواہوں نے مجھے متعدد بار بتایا کہ انہوں نے محلفین برائے خودکشی کو دیکھا کہ جب ان پر سنگین کا وار کیا جاتا ہے تو وہ رائفل کی نالی کو مضبوطی سے پکڑ کر سنگین کی انی کو اپنے جسم میں زیادہ گہرا گھونپ لیتے ہیں تاکہ حملہ آور دشمن سپاہی اپنے اتنا قریب لاسکیں تاکہ اس پر ضرب لگاسکیں اور پھر اسے مار گراتے ہیں''۔

حلف برائے خودکشی نے خودکشی اور قتل کے فرق کو مٹا دیا ہے۔ وحدت مقصد متعلقہ شخص کو آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے، اور اس کی توجہ کو اس تشدد میں کود پڑنے پر مرتکز کر دیتی ہے جس کا ارتکاب کرنا اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ اس کے قاتلانہ حملے کے شکار اور اس کی اپنی قربانی کی خواہش کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیتی ہے۔ جدید تکنیکیات نے وہ اوزار مہیا کر دیے ہیں جو اس مہلک ادغام کو ہیبت ناک شکل عطا کر دیتے ہیں۔ اس کی مثالیں ہیں وہ انسانی بم بنی لڑکی ہے جو اپنے دشمن کے قریب پہنچتے پہنچتے اپنے آپ کو دھماکے سے اڑا دیتی ہے اور ایندھن سے بھرے جہاز کے پائلٹ کی نشست پر بیٹھا وہ نوجوان جو انسانی جانوں سے پُر ٹاور سے اپنے جہاز کو ٹکرا دیتا ہے۔

کربلا کے مقام پر شہادت

حلف برائے خودکشی میں خودکشی اور قتل کی یکجائی اسلامی شہادت کے دو بنیادی عناصر، یعنی ابتلا اور جنگ کے درمیان اساسی ربط قائم کرتی ہے۔ تیسرے اور آخری واقعے میں شہادت کے شیعی تضمن یا تصور کو اس کی بنیادی کہانی کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ یہ ہے کربلا میں نواسہ رسول [صلی اللہ علیہ وسلم] حسین

[رضی اللہ تعالیٰ عنہ] کا قتل۔ ماضی کی تمثالی ہستیوں کے ذریعے حال میں زندہ رہنے کے رواج نے کہانی اور اس کے پیغام کی مستقل موزونیت کو آسان بنا دیا ہے۔

جو واقعات کربلا کے سانحے کا پیش خیمہ بنے وہ یوں ہیں: محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کا انتقال سن ۶۳۲ء میں ہوا۔ آپ نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نرینہ نہ چھوڑی تھی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی روحانی اور سیاسی وراثت وجہ تنازع بن گئی۔ فریقین نزاع نے اپنے حق کے دعوے کی بنیاد یا تو پیغمبر (اسلامؐ) سے قریبی رشتے داری پر رکھی اور یا پھر شہر مدینہ کے سربرآوردہ خاندانوں سے تعلقات پر، جہاں سے محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] نے عرب کو سیاسی اور مذہبی طور پر متحد کیا تھا۔ بعد کے پانچ عشروں میں محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کے پانچ جانشینوں کو قتل کیا گیا، مسلمانوں کی افواج ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئیں، اور مشرق وسطیٰ کے بیشتر علاقوں پر عربوں کے پھیلاؤ کی اولین بڑی لہر کے ساتھ علاقائی مفادات کی گروہ بندی سرایت کر گئی۔

ان واقعات کے رونما ہونے کے عمل میں سب سے اہم عنصر چوتھے جانشین یا خلیفہ علی [رضی اللہ عنہ] کی ذات تھی۔ بہت سے لوگوں کی نظر میں پیغمبر [صلی اللہ علیہ وسلم] نے متعدد سماجی تعلقات کی بنا پر علی [رضی اللہ عنہ] جو کہ ان کے قبیلے کی متوازی شاخ سے عم زاد تھے، کو بیٹوں کی طرح پالا پوسا تھا اور ان سے اپنی سب سے پیاری بیٹی فاطمہ [رضی اللہ عنہا] کا نکاح کیا تھا۔ علی [رضی اللہ عنہ] کو ان کی خلافت کے پانچویں سال میں قتل کر دیا گیا۔ خلافت ایک دوسرے قبیلے بنو امیہ میں منتقل ہو گئی اور خلافت کا انحصار انتخاب کی بجائے وراثت قرار پایا۔ تقریباً دو عشروں بعد علی [رضی اللہ عنہ] کے دوسرے بیٹے حسین [رضی اللہ عنہ] نے اس صورت حال کے خلاف آواز بلند کی، اور ۶۸۰ء میں (اہل کوفہ کی) حمایت کے عیارانہ جھوٹے وعدے کی بنا پر عراق میں کربلا (لفظی مطلب: مقام کرب) کے مقام پر ۷۲ افراد پر مشتمل ان کے قافلے کے ساتھ ان کو قتل کر دیا گیا۔

حسین [رضی اللہ عنہ] کے فریب کارانہ قتل نے سنیوں اور شیعوں کے درمیان تفرقہ حتمی طور پر پختہ کر دیا۔ سنی بنو امیہ کی خلافت کو تسلیم کرتے تھے جبکہ شیعہ (شیعان علی کا مخفف) کا اصرار تھا کہ صحیح امیر پیغمبر [صلی اللہ علیہ وسلم] کے قریبی رشتہ داروں میں سے ہونا چاہیے۔ امیر کے اوصاف، مابعد الطبیعاتی مسلمات،

اخلاقیاتی تقاضوں اور مذہبی عقائد اور معاشرتی طور طریقوں کے کئی دیگر پہلوؤں کے بارے میں اختلافات نے دونوں گروہوں میں مزید بُعد پیدا کر دیا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پھیلتا اور گہرا ہوتا گیا۔ سنی اکثریت کے قانون میں نظم وضبط کو سب سے زیادہ فوقیت حاصل تھی، اور ان کی نظر میں سرکشی ہی سب سے اہم خطرہ تھا جس کا فرو کرنا ضروری تھا۔ شیعہ جو اقلیت میں تھے، حکمرانی کا سب سے بڑا فریضہ عدل کو قرار دیتے تھے اور استبداد کو سب سے بڑا دشمن گردانتے تھے جس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

کربلا کی حکایت شہادت کا احاطہ کرتی ہے، نیز یہ شیعہ مزاج کا نمایاں عنصر ہے اور اس کے ترجمانوں کو تین موضوع مہیا کرتی ہے: حسین [رضی اللہ عنہ] کا ابتلا، اس کی ارادیت اور اس کا جنگی منظرنامہ۔ حسین [رضی اللہ عنہ] کے لمحہ بہ لمحہ دردناک انجام کے بیان میں ہر تفصیل کے سیر حاصل ذکر سے ان کا رنج وغم نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے: انہوں نے اپنی گود میں اٹھائے شیرخوار بیٹے کے لیے پانی حاصل کرنے کی کیسے وکالت کی، جس کو پانی دینے کے بجائے تیر سے چھلنی کر دیا گیا۔ انہوں نے چند نفوس کے ساتھ دشمن کی کثیر تعداد کے خلاف نام نہاد طویل جنگ میں اپنے تمام ساتھیوں کے قتل کے بعد اپنے قاتلین کا کیسے سامنا کیا، ۷۰ تیروں سے جسم چھلنی ہونے کے بعد انہوں نے کیسے جان، جان آفریں کے سپرد کی، اموی خلیفہ کے پاس لے جاتے ہوئے راستے میں کیسے ان کے دھڑ سے علیحدہ کیے ہوئے سر کو پکڑ کر صوبائی گورنر نے منہ پر چھڑیاں ماریں۔

شیعہ روایات میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حسین [رضی اللہ عنہ] نے شہادت اور اپنے انجام کو ان کی کل تفصیلات کے پورے علم کے ساتھ اپنی مرضی سے منتخب کیا تھا اور سیاست اور وراثت سے ماوری ایک خاص مقصد کے تحت ایسا کیا تھا۔ (شیعہ سمجھتے ہیں کہ) اموی عہد حکومت میں اسلام کی سمت اقتدار اور دولت کی طرف پھر گئی تھی، اور بدعنوانی اور جبر کے در کھل گئے تھے۔ حسین [رضی اللہ عنہ] کا اپنی ابتلا اور موت گلے لگانے کا مقصد لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے پکارنا اور مومنین کو آسودہ خاطری سے جھنجھوڑ کر جگانا تھا تاکہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق آواز بلند کریں۔ ان کی قربانی کی غرض وغایت انہیں دوبارہ انصاف کی راہ پر لگانا اور اسلامی معاشرے کا دوبارہ قیام تھا۔

آخری بات یہ ہے کہ حسین [رضی اللہ عنہ] کی شہادت اس میدان جنگ میں ہوئی جہاں وہ برائی کی

طاقتوں کے خلاف لڑے۔ انہوں نے تھپڑ کے لیے دوسرا گال آگے نہیں کیا، انہوں نے اپنے حامیوں کو دشمن پر ٹوٹ پڑنے سے نہیں روکا۔ مرثیہ نگاری میں، جس کے ذریعے کربلا کے قصے کے ہر انچ پر خوبصورت نقش کاری کی گئی ہے، ہمیں بہ تاکید بتایا جاتا ہے کہ حسین [رضی اللہ عنہ] ایک ہیبت ناک جنگجو تھے جن کو کبھی بھی شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔ تا آنکہ انہوں نے خود مزاحمت سے گریز کا فیصلہ نہ کر لیا تا کہ ان کی شہادت پایہ تکمیل کو پہنچ سکے۔

شیعوں نے بطور کفارہ برداشت کی ہوئی ابتلا اور ناانصافی کے خلاف لڑائی کے قصے کو بار بار بیان کر کے گویا اسے ستاروں کے ایک ایسے جھرمٹ کی شکل دے دی ہے جو مومنوں کے لیے راہنمائی، دعوت اور ترغیب کا باعث ہے۔ مائیکل فشر نے اسے کربلا کے علامتی نمونہ کا نام دیا ہے۔ کربلا کی یاد شیعوں کی شناخت اور (ان کے خیال میں) وجہ احترام بن گئی ہے۔ (ان کی نظر میں) یہ ایک مقدس زخم ہے، جسے شروع سے اب تک کھلا رکھا گیا ہے۔ ایک ایسے کنویں کی مانند جس سے شناخت اور مقصد کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ اس قصے کی قائم رہنے والی قوت بار بار کے ذکر اور شناخت سے حاصل ہوتی ہے۔

ہر سال پورے ماہ محرم میں، جس میں یوم عاشورہ یعنی وہ دن آتا ہے جس دن حسین [رضی اللہ عنہ] کو قتل کیا گیا تھا، کربلا کے واقعات کی بار بار علامتی اور رسمی تمثیل دہرائی جاتی ہے۔ اس میں شیعوں کے گھروں میں اشعار کا پڑھے جانا، امام باڑوں میں ذکر کے واقعات کی ڈرامے کی شکل میں مخصوص طرز سے پیش کاری، اور سڑکوں اور گلیوں میں حسین [رضی اللہ عنہ] کے مقبرے کی شبیہ کے تعزیوں کے جلوس جن کے ساتھ اکثر ماتم کرنے والے ہوتے ہیں جو خنجروں سے اپنے ماتھوں کو زخمی کر لیتے ہیں --- شامل ہوتے ہیں۔ ان رسومات کے نتیجے میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ بعد میں بھی جاری رہتی ہے۔ شیعوں میں یہ قول مشہور ہے کہ ایک (شیعہ) شخص کو ایسے زندہ رہنا چاہیے جیسے کہ ہر دن یوم عاشورہ ہے اور ہر جگہ کربلا ہے''۔

محرم کے واقعات کے دوران، ماضی وحال ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں زمانے ان کے ماننے والوں کی ہستیوں میں —— ان کے ذہنوں میں اور ان کے گوشت پوست میں —— یکجا ہو جاتے ہیں۔ محرم کے جلوس کے شرکاء، حسین [رضی اللہ عنہ] کی تکلیف کی انتہا کو خود اپنے جسموں پر محسوس

اور برداشت کرنے کی آرزو کرتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ ان پر ان لوگوں سے، جنہوں نے یہ تکلیف پہنچائی، شدید اور جائز غضب ناکی کے ساتھ انتقام لینے کی دھن سوار ہوتی ہے۔ جوں جوں (ماتمی) جلوس آگے بڑھتا ہے رنج وغم، گریہ وزاری اور کرب ناکی آنکھوں اور کانوں میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ بدلے کا ہیجان خیز رجحان جیسے ان کے اندر جوش مار رہا ہوتا ہے اور وہ ذرا سے اشتعال پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ہندوستانی مصنف وکرم سیٹھ نے اس کیفیت اور اس کے فوری پھٹ پڑنے کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نے اپنے ناول ''ایک موزوں لڑکا'' جو کہ اوائل ۱۹۵۰ء کے دور کے بھارت کے منظرنامے میں لکھا گیا ہے، میں دکھایا گیا ہے کہ ایک حسینی ماتمی جلوس کا اچانک جشن منانے والے راما جلوس سے ٹکراؤ ہو گیا اور فوراً ہی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان دلوں میں بھری نفرت ایک لڑائی کی صورت میں پھٹ پڑی اور خون خرابہ ہو گیا۔

آیت اللہ خمینی کی تندخو رہبری کے تحت ۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب اور اس کے نتیجے میں قائم شدہ حکومت نے اس علامتی امتزاج کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ شاہ کے خلاف جدوجہد کو حسین [رضی اللہ عنہ] اور اموی حکومت کے درمیان جنگ کے روپ میں پیش کیا۔ شاہ کے خلاف جلوس محرم کے ماتمی جلوس بن گئے۔ سیاسی جلوسوں نے ماتمی جلوسوں کی شکل اختیار کر لی اور عاشورہ کے دن تہران میں ایک لاکھ نفوس جلوس میں شامل ہوئے، اور اس کے صرف دو ماہ بعد خمینی فاتح بن کر ایران میں داخل ہوا۔

خمینی اپنے اصل منصوبے یعنی ایرانی انقلاب کو عالم اسلام میں برآمد کرنے میں تو کامیاب نہ ہو سکا تاہم اس کی طرف سے شہادت کے ساتھ خودکشی کی پیوندکاری عراق کے خلاف جنگ میں تکمیل پذیر ہوئی اور جسے حزب اللہ نے دہشت گردی بذریعہ خودکشی کی وساطت سے نئے اوزاروں سے مزین کیا اور یہ وسیع پیمانے پر پھیل گئی۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں شیعہ عسکریت پسند نے دھماکا خیز مواد سے بھرے اپنے ٹرک امریکی اور اسرائیلی تنصیبات سے ٹکرائے، بعدازاں اس سے فلسطینی حماس کی کارروائیوں کو تحریک ملی۔

خاتمہ کلام

مندرجہ بالا تین تاریخی واقعات میں سامنے آنے والی قتل بذریعہ خودکشی میں علامتی تشکیلات کے

مابین ایک خصوصیت مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے وہ یہ کہ ان میں ان اختلافات کو محو کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو دن کی روشنی میں اہم ہوتے ہیں ـــــ یعنی خود اپنی ہلاکت اور دوسروں کی ہلاکت کے مابین، روانگی اور آمد کے مابین اور ماضی، حال اور مستقبل کے مابین اختلافات۔ قربانی اور قربان ہونے والا شخص حلف برائے خودکشی کو تقدیس عطا کرتے ہیں۔ خودکش بمباز کا انگوٹھا جب دھماکہ خیز مادے کو چلانے کے لیے بٹن دباتا ہے اسے اسی وقت بہشت میں پہنچا دیتا ہے۔ حشیشین لڑکی نے تو پہلے ہی اپنے مستقبل کی جھلک دیکھ رکھی ہوتی ہے۔ یہ محفوظ طریقے سے جانا پہچانا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو جرأت سے بھرپور ماضی میں ڈوبے ہوتے ہیں، موجودہ افعال اس ماضی سے صواب اور قوت حاصل کرتے ہیں۔

زندگی اور موت کے درمیانی وقفے کی عام طور پر وقوع پذیر ہونے والی اذیت ناک ذہنی و قلبی کیفیت پر قابو پانا صرف مسلم دہشت گردوں کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ موجودہ ہزاریے کی دیگر تحریکات، فرقوں اور بعض خیالی جنت کے حصول میں مصروف کار معاشروں کا بھی مسئلہ ہے۔ اس کیفیت پر قابو پانے کے طریقے ان سب میں مختلف ہیں۔

(ہر سہ واقعات میں سے) ہر ایک تاریخی واقعے کا مختلف اور مخصوص ایجنڈا تھا۔ حشیشین انتقال کی ذہنی اضطرابی کیفیت، اس زندگی اور اگلی زندگی کے درمیان خلا کو مختصر کر کے ختم کرتے تھے۔ حلف برائے خودکشی، قتل اور خودکشی کو قربانی کے واحد فعل میں ڈھال کر ان کو ملحدانہ اخلاقی اور طبعی تعبیرات سے پاک کرتے تھے۔

(شیعہ اور سنی) کارروائیاں کرنے والوں کو کربلا کے واقعات اور محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کے حملوں کا ذکر اخلاقی شکوک وشبہات اور خانہ نشینی کی کشش سے بچاتا ہے۔

عمومی ایجنڈا اس اساسی فرق کو واضح کرتا ہے جو صالح اقلیت اور بے بصیرت، ناتوان یا بدقماش ہجوم کے مابین پایا جاتا ہے۔ اس کا تعلق خیر وشر کے درمیان بہت مہین خط کھینچنے سے ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو قتل بذریعہ خودکشی پر عمل درآمد کرتے ہیں، استثنائی پارسائی کا تصور یا زیر تربیت ولی ہونے کا تصور، متعلقہ تحریک کے معمول میں پڑے شگاف کو پُر کر دیتا ہے۔ وہ ارکان جن کی محض اپنی ذات کی قربانی کی بنا پر قدر و قیمت ہوتی ہے ان کو نہ صرف بدقماش لوگوں پر فوقیت کے احساس کی ضرورت ہے بلکہ ان کو اپنی موت

کے بعد زندہ رہ جانے والے ساتھیوں پر بھی برتری کا احساس درکار ہے۔

[کیرن انڈریالو سنیٹ یونیورسٹی آف نیویارک میں شعبہ علم بشریات میں پروفیسر ہیں۔]

دسویں صلیبی جنگ

الیگزینڈر کوکبرن*

ترجمہ: نورا کبیہ قاضی

مرنے والوں کے مرثیوں اور انکی یادوں کی رسومات کے ساتھ ہی سب سے اضطراب انگیز سوال یہ سامنے آتا ہے: ''کیا دہشت گردی کے خلاف واقعی کوئی جنگ لڑی جارہی ہے؟ اگر ہاں تو اس کے مقاصد کیا ہیں؟''

طالبان کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ افغانستان کے کھیتوں میں پھر سے پوست کی کاشت شروع ہو چکی ہے۔فوجی بجٹ میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ہر سرنامہ عراق پر حملہ کی دھمکی کے بگل بجارہا ہے۔وطن [امریکہ] کے اندرونی محاذ پر حقوق کے مسودۂ قانون (Bill of Rights) کے خلاف جنگ پورے زور وشور سے لڑی جارہی ہے۔خواہ اس سے اٹارنی جنرل جان ایش کرافٹ کی مقبولیت میں روز بروز کمی ہی کیوں نہ واقع ہو رہی ہو جن کے غیر آئینی اقدامات پر جج صاحبان بھی شدید ناراضگی کا اظہار کر چکے ہیں۔

ان اقدامات کے نتیجے میں ابھرنے والے ہنگاموں میں جو آئینی نقصان ہوگا اس کی تلافی کے لیے کئی نسلیں درکار ہوں گی۔ کئی عشروں سے ملک میں موسم گرما میں گھاس کے اندر پیدا ہونے والے کھڑکھڑاتے سانپوں کی طرح ہنگامی قوانین نافذ ہوتے چلے آرہے ہیں۔''ہیومن رائیٹس واچ'' کے جوآن میریز نے مجھے بتایا تھا کہ ''دشمن لڑاکوں'' کو بغیر مقدمہ چلائے اور بغیر وکیل مہیا کیے حراست میں لینے اور نظر بند رکھنے کے لیے حکومت جس قانونی استحقاق کو استعمال کر رہی ہے وہ ایک ہڑتال توڑ (strikebreaking) فیصلہ ہے۔ [امریکی] حکومت کے ۲۷ اگست کے Padilla ''دشمن جنگ باز'' مقدمے کے قانونی خلاصہ میں سپریم کورٹ کے ۱۹۰۹ء میں موئر (Moyer) بمقابلہ پی بوڈی

---

* Alexander Cochurn, "The tenth Crusade" *The Nation*, New Yark, Sep. 23, 2002, p.9

(Peabody) مقدمے کے فیصلے پر بہت زیادہ انحصار کیا گیا ہے۔

یہ مقدمہ چارلس موئز سے تعلق رکھتا تھا جو کالوریڈو کی ایک ہیجان زدہ ٹریڈ یونین ویسٹرن فیڈریشن آف مائنرز کا صدر تھا۔ اس یونین نے پرتحفظ حالات کار، چائلڈ لیبر کے خاتمہ، کمپنی کی کچی رسید کی بجائے نقد رقم کی صورت میں معاوضہ دینے پر اصرار جیسی انقلابی اصلاحات کے لیے جدوجہد کی تھی۔ کالوریڈو کے گورنر نے اس ٹریڈ یونین کو کچلنے کے لیے اعلان کر دیا کہ اس نے بغاوت برپا کر دی ہے اور ریاستی فوج بلا لی اور موئز کو بلا جواز اور بغیر کسی قانونی کارروائی کے ڈھائی ماہ کے لیے نظر بند کر دیا۔

ایک رائے میں، جو چاپلوسانہ انداز میں قوت عاملہ کو تسلیم کر لیتی ہے، سپریم کورٹ نے (بحری جہاز کے کپتان کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے) موئز کی نظر بندی کو برقرار رکھا۔ اس نے یہ استدلال پیش کیا کہ فوج تو ہڑتالیوں پر فائر بھی کر سکتی تھی (عدالت کے الفاظ میں ''غیر قانونی باغی گروہ'') تو موئز کو محض نظر بندی کی شکایت کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟ اب حکومت Padilla کیس کے قانونی شخص کو وجۂ جواز بنا کر یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ جو کچھ ایک ریاست کا گورنر کر سکتا ہے، ملک کا صدر اس سے بھی بدرجۂ اتم کر سکتا ہے۔

اب عین ہماری آنکھوں تلے حکومت کا ایک نیا خفیہ بازو بڑی ہوشیاری کے ساتھ خوفناک رمزفیلڈ کے ذریعے وجود میں لایا جا رہا ہے جس نے سیکرٹری آف سٹیٹ پاول کی جگہ سنبھال لی ہے۔ رمزفیلڈ برسر عام ایسے بیانات جاری کر رہا ہے جو اسرائیل کے مغربی کنارے، غزہ پر قبضہ اور یہودیوں کی بستیوں کے بارے میں امریکہ کی سرکاری پالیسی کی تردید کرتے ہیں۔ رمزفیلڈ نے کانگریس سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ایک نئے انڈر سیکرٹری برائے دفاع کو یہ اختیار دے کہ وہ تمام خفیہ دفاعی معاملات کی نگرانی کرے۔ اس نے یہ درخواست بھی کی ہے کہ اس محکمہ کو زیادہ پاؤں پھیلانے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ وسیع پیمانے پر اپنا کام کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۸۷۸ء کے Posse Comitatus Act کو یا تو کوڑے میں پھینک دیا جائے یا مٹا دیا جائے جو داخلی قوانین کے نفاذ میں امریکہ کے فوجی کردار کی کسی بھی قسم کی مداخلت کی ممانعت کرتا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ فوجی حکومت کا سایہ شفاف گنبد کے اندر اور بھی واضح طور پر دکھائی دینے لگا ہے۔

اسامہ بن لادن کی تقاریر اور پیغامات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دہشت گرد ہوابازوں کو امریکیوں سے کچھ شکایات اور رنجشیں تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ امریکی فوجی سعودی عرب سے نکل جائیں۔ وہ امریکہ کو اسرائیل کے سب سے بڑے پشتیبان اور فلسطینیوں پر توڑے جانے والے مظالم کے اخراجات کے کفیل کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ وہ ان پابندیوں کی مذمت کرتے تھے جو عراق کی شہری آبادی کو مارے ڈال رہی تھیں۔

ایک سال گزرنے کے بعد بھی امریکی فوجی بدستور سعودی عرب میں موجود ہیں۔ شیرون کے لیے امریکی تائید و حمایت میں اور بھی زیادہ جوش و خروش پیدا ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی صدام حسین کے خلاف اس قسم کے ہوائی حملوں کے لیے زمین ہموار ہو رہی ہے جو تباہ کن بمباری کے ساتھ شروع ہوں گے اور عراق کی شہری آبادی کو ۱۹۹۰ء کے ابتدائی دنوں کے بدترین مصائب میں دھکیل دیں گے۔

ریاستوں کے خلاف دہشت گردی سیاسی مایوسیوں کی سڑاند کی پیداوار ہوتی ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں کرۂ ارض کی آدھی آبادی یعنی دو ارب اسی لاکھ لوگ دو ڈالر یومیہ سے بھی کم آمدنی پر گزارا کرتے ہیں۔ سب سے امیر دو کروڑ پچاس لاکھ امریکی اس سیارے کے دو ارب سے زیادہ غریب ترین لوگوں سے زیادہ آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ پچھلے تمام سال اقتصادی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے تھے۔ سب سے بڑھ کر دھماکہ خیز صورت حال لاطینی امریکہ میں پیش آئی جہاں پیرو، ارجنٹائن اور وینز ویلا سب بحرانوں تلے کراہ رہے ہیں۔

کیا کوئی چیز عراق کی خودسری کے خلاف ہنگامہ آرائی روک سکتی ہے؟ وال سٹریٹ پر ایک حقیقی سرد بازاری یقیناً اسے التوا میں ڈال دے گی۔ ایسے ہی جیسے توانائی کی قیمتوں میں اضافہ، اگر واقعی جنگ شروع ہو جائے تو معیشت کو کمر توڑ ضرب لگائے گا جبکہ اس کو اس کی بالکل ہی ضرورت نہیں ہے۔

عراق پر حملہ کس طرح دہشت گردی کے خلاف جنگ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ انتظامیہ نے ابتداء میں، غالباً بعد میں پچھتانے کے لیے، اس دعوے کو ترک کر دیا تھا کہ عراق گیارہ ستمبر والے حملوں میں ملوث تھا۔ طالبان کے افغانستان سے ہٹ کر جس بڑی قوم پر الزام لگایا جا سکتا ہے وہ سعودی عرب تھا جو القاعدہ کے بہت سے دہشت گرد ہوابازوں کا ملک تھا۔

کیا عراق پر حملہ ایک جوابی کارروائی ہوگی؟ اگر اس نے سعودی عرب کے تیل پیدا کرنے والی ایک بڑی لہر کے کردار کو گھٹا دیا یا اگر اس نے عرب رائے عامہ پر شدید نفرت کا اظہار کیا تو اس کا جواب اثبات میں ہے۔ مگر کسی کو اس میں شک نہیں ہونا چاہیے کہ اگر بش انتظامیہ نے صدام حسین کو واقعی اقتدار سے الگ کر دیا اور بغداد پر قبضہ کر لیا تو یہ حقیقی طور پر ایک نامعلوم سمت چھلانگ لگانے کے مترادف ہوگا۔ یہ حماقت اسلامی انتہا پسندی کی چنگاریوں کو ہوا دے گی۔ جو عملی طور پر ۱۹۸۰ء کے عشرہ کے اختتام پر عروج کو پہنچی اور جس کے زوال پذیر ہو جانے پر گیارہ ستمبر کے حملے ابتدائی کارروائی کی بجائے اختتامی کارروائی تھے۔

اگر امریکی فوجی بغداد میں آ کر ڈیرہ ڈال لیں تو یہ صورت حال کیا ایران کے لیے قابل برداشت ہو گی؟ اور کیا صدام کا خاتمہ اردن کی بادشاہت اور اس کے ساتھ ہی سعودی خاندان کی حکومت کا تختہ الٹا جانے کا پیش خیمہ نہ ثابت ہوگا؟

ایک سال پہلے مسلمان مذہبی جنونیوں نے ان جہازوں کو اڑایا اور اب ہم یہودی اور عیسائی مذہبی جنونی سرزمین مقدس کی بازیابی کا خواب پورا کرنے کے لیے ایک خوفناک اتحاد کی صورت میں منظم و مربوط ہو چکے ہیں۔ ایسا کرنا تیرہویں صدی کی طرف مراجعت، اور شہزادہ ایڈورڈ کی ختم کی ہوئی نویں صلیبی جنگ سے آگے پیش رفت کرنا ہے (یعنی دسواں صلیبی محاربہ کھولنا ہے)۔

دہشت گردی کی مالی امداد کا انسداد

سڈنی وینٹروب*

ترجمہ: ڈاکٹر فخر الاسلام

دہشت گردی کے خلاف حالیہ جنگ کے دو معاشی پہلو ہیں۔ ان میں سے ایک مثبت کوشش تو وہ ہے جس کا مقصد مختلف اقدامات کے ذریعے امریکی معیشت کو تقویت پہنچانا ہے۔ یہ کوشش ۱۱ ستمبر کے واقعے سے پہلے بھی ہو رہی تھی اور اس سانحے کے بعد اس میں مزید تیزی آ گئی ہے۔ دوسرا پہلو انسدادی نوعیت کا ہے یعنی کہ دہشت گردوں کی مالی اعانت کو یا تو مکمل طور پر منقطع کیا جائے یا پھر اس کو محدود کر دیا جائے۔ اس ضمن میں بھی ۱۱ ستمبر سے پہلے ہی کوششیں ہو رہی تھیں مگر وہ ناکافی اور ناکام ثابت ہوئیں۔

امریکی معاشرے کے کھلے پن، مروجہ بین الاقوامی مالیاتی نظام اور کثیر سرمائے کی عام معمول کے مطابق روزانہ منتقلی کے سبب دہشت گردی کے مقاصد کے لیے سرمایہ کی منتقلی کو روکنا کافی مشکل امر بن گیا ہے۔ عالمگیریت (Globalization) کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک مختلف ممالک کو سرمائے کا آزادانہ انتقال ہے جو تقریباً ایک کھرب ڈالر روزانہ ہے۔ بدقسمتی سے یہ سہولت بسا اوقات غیر قانونی کاموں یعنی منشیات اور دہشت گردی کے فروغ کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ اس نظام میں سرمائے کی غیر قانونی منتقلی کو تلاش کرنا سوکھی گھاس کے بڑے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈنے کے مترادف ہے۔ پھر بھی کوششیں جاری رہنی چاہئیں۔

اگرچہ امریکہ کے لیے دہشت گردی کی تمام تر منصوبہ بندی کو طشت از بام کرنا ممکن نہیں لیکن چند ضروری اقدامات کے ذریعے اس سرمائے کا تعاقب ممکن ہے جس سے اسامہ بن لادن یا دہشت گردوں کو تحفظ فراہم کرنے والے ممالک اپنے عزائم کی تکمیل کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ عالمی مالیاتی نظام اور

---

*Sicney Weintraub, "Disrupting the Financing of Terrorism", *The Washington Quarterly*, Winter 2002, pp. 53-60

امریکی شہریوں کے بنیادی حقوق میں رخنہ ڈالے بغیر یہ ضروری اقدامات کیسے کیے جاسکتے ہیں؟

مسئلے کا تعین: سرمائے کا انتقال اور ٹیکس کے لیے محفوظ مقامات

امریکی سینیٹر پال سربینز (Paul Sarbanes) جو سینیٹ کی کمیٹی برائے بینکاری کے چیئرمین بھی ہیں، نے ناجائز انتقال سرمایہ (money laundering) کو دہشت گردوں کی مہمات چلانے کا بڑا ذریعہ قرار دیا۔ امریکی انتظامیہ اور کانگریس کے درمیان سرمائے کی منتقلی کو روکنے کے حوالے سے تعاون کی فضا موجود تو ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ کام (انتقال سرمایہ) ایک سے زیادہ اور نت نئے طریقوں سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی امریکہ دوسرے ممالک کے ساتھ اس رجحان کو روکنے کے لیے تعاون بڑھانے کی کوشش کرتا ہے دولت کی ترسیل کرنے والے اپنے طریق واردات بھی تبدیل کر دیتے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں امریکہ نے کالا دھن روکنے کا جو قانون نافذ کیا تھا اس کا مقصد اندرونی مسائل پر قابو پانا تھا لیکن اب سرمایہ بڑی آسانی سے سرحد پار منتقل ہو رہا ہے۔ یہ عالمگیریت کا دور ہے جس میں امریکہ سمیت سو دیگر ممالک سے سرمایہ باہر جاتا اور واپس آتا ہے۔ اس لیے اس مسئلے سے نمٹنا اکیلے امریکہ کے بس کا کام نہیں۔

کالے دھن اور ناجائز ترسیل زر کے طریقوں میں منشیات کی تجارت، سمگلنگ، منافع خوری اور روزگار کے متلاشی افراد کو مختلف ممالک میں بسانے کا دھندہ اور دہشت گردی شامل ہیں۔ ترسیل زر کے غیر قانونی اداروں میں کالے دھن والوں کے زیر اثر بینک، دیگر مالی ادارے اور مشرق وسطیٰ کے حوالہ نظام (ہنڈی) جیسے عالمی جال شامل ہیں۔ ان اداروں کا طریقہ کار یہ ہے کہ ناجائز دولت کو بظاہر جائز ثابت کر کے ان سے درآمدات کی ادائیگی اور اثاثوں کی خریداری جیسے جائز کام لیتے ہیں۔ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (IMF) کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے مطابق دنیا میں ناجائز ترسیل زر کل عالمی پیداوار کا دو سے پانچ فیصد یا ۸۰۰ بلین اور ۲ ٹریلین ڈالر سالانہ کے درمیان ہے۔

امریکی سینیٹ کی بینکاری کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے وزارت خزانہ کے ایک افسر نے بتایا کہ دہشت گردی کے لیے سرمائے کی فراہمی کا طریق کار عام انتقال سرمایہ سے مختلف نہیں۔ یہ صاحب کولمبیا کی منشیات کی تجارت سے آنے والے سرمایہ کے کنٹرول پر مامور تھے۔ انہوں نے کمیٹی کو بتایا کہ کس

طرح کولمبیا کے تاجران منشیات نے اپنے حصص ۳۰ فیصد رعایت کے ساتھ پیشہ ور لوگوں کو فروخت کیے جو کالے دھن کو سفید کرنے کا فن جانتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کولمبیا کے منشیات سے حاصل شدہ سرمایہ میں سے سالانہ ۵ بلین ڈالر سفید کیا جاتا ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ منشیات کے تاجروں نے ایک موقع پر امریکہ کے اندر سرمائے کی تطہیر کو ترک کیا لیکن انہوں نے متبادل راستہ یہ اپنایا کہ کچھ غیر ملکی بینکوں کی وساطت سے یہ سرمایہ امریکی بینکوں میں جمع کرایا۔ اول الذکر بینک امریکہ میں بہت زیادہ جانچ پڑتال سے آزاد تھے۔

امریکی بینکوں تک رسائی کے لیے دنیا کے مختلف علاقوں میں خفیہ بینک (shell banks) قائم کیے گئے ہیں۔ اس قسم کے بینکوں کا بظاہر نہ تو کوئی وجود ہوتا ہے اور نہ ان کا دوسرے بینکوں سے کوئی الحاق۔ حالیہ دنوں میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ امریکہ کے معروف مالی ادارے یہ نہیں سمجھ پاتے کہ جن بینکوں کے ساتھ وہ معاملہ کر رہے ہیں ان کی اصل حقیقت کیا ہے؟ حال ہی میں مختلف حکومتوں نے دنیا کے ۵۰ ممالک میں مالی سراغ رسانی کے مراکز قائم کیے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ اطلاعات کا تبادلہ کر رہے ہیں۔

ٹیکس چوری کے محفوظ مقامات بڑی حد تک ناجائز ترسیل زر کا حصہ ہیں۔ ٹیکس چوری کے ان محفوظ مقامات سے مراد مختلف ممالک میں قائم غیر ملکی بینک ہیں جہاں پر بیرونی سرمایہ اس لیے رکھا جاتا ہے تاکہ اندرون ملک ٹیکس حکام کے علم میں نہ آسکے۔ ۱۹۸۹ء میں دنیا کے سات بڑے صنعتی ممالک کی تنظیم جی سیون نے مالیاتی اثاثہ جات کے ایک مہم جو دستے (Task Force) کا قیام عمل میں لایا تاکہ وہ سرمائے کے نقل و حمل پر کڑی نظر رکھے۔ آج سے دو سال قبل جی سیون نے ان ٹیکس چور مقامات کی فہرست تیار کر لی اور جن ممالک میں یہ قائم تھے ان پر اقتصادی پابندیاں لگانے کا اصولی فیصلہ بھی ہوا۔ اس فہرست میں اب کوک جزیرہ، ڈومینیکا، مصر، گوئٹے مالا، گرینڈا، ہنگری، انڈونیشیا، اسرائیل، لبنان، جزیرہ مارشل، میانمار، ناورو، نائیجریا، نیو، فلپائن، روس، سینٹ کٹس، اور یوکرائن سمیت کئی ممالک شامل ہیں۔

ٹیکس کے محفوظ مقامات کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ یہ بینکوں کو اخفا (secrecy) فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ سویٹزرلینڈ کے بینک ۱۹۳۵ء سے ترقی کے منازل طے کرنے لگے جب وہاں پر

بینکوں کے رازداری (confidential) قوانین نافذ کیے گئے۔ اس رازداری کا فائدہ خود اس ملک کو جو بھی ہوتا ہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس سے ٹیکس چوری اور ناجائز دولت کے تحفظ جیسی چیزوں کو تقویت ملتی ہے۔ بینکوں کی رازداری کا مثبت پہلو کچھ لوگ یہ بتاتے ہیں کہ اس کے ذریعے شکست وریخت کے حامل معاشروں، سیاسی مخالفین اور غیر جمہوری حکومتوں سے تحفظ مل جاتا ہے۔ بایں ہمہ رازداری کے قوانین کسی ملک سے انفرادی سرمائے کے فرار اور افراط زر کے خوف سے منتقل ہونے والی کمپنیوں کا کھوج لگانا ناممکن بناتے ہیں ان ہی سوئس بینکوں نے نازی جرمنی کے ہاتھوں تعذیب کا نشانہ بننے والے یہودیوں کو تحفظ فراہم کیا۔

بینکوں کے رازداری قوانین کے حق میں چاہے جتنے بھی دلائل لائے جائیں یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ان کے ذریعے ٹیکس چوروں، مجرموں اور کالے دھن والوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ ٹیکس چوری کے محفوظ بینکوں کی تعداد میں بے محابہ اضافہ اور ان میں جمع ہونے والے بڑے حجم کے سرمائے سے آخر کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ بحرالکاہل کے چھوٹے جزیرے ناورو (Nauru) میں اس قسم کے بینکوں کی تعداد ۴۰۰ ہے جن کو ایک ہی حکومت نے رجسٹریشن دی ہے۔ نیویارک کے مین ہیٹن کے ڈسٹرکٹ اٹارنی رابرٹ مارجینتھاؤ (Robert Mergenthau) کے مطابق ایک اور جزیرے کیمین (Cayman) میں سرمایہ گزشتہ ۳ سالوں میں ۵۰۰ سے ۸۰۰ بلین ڈالر تک بڑھ گیا۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹیکس چوری سے رفاہ عامہ کا کوئی کام انجام دیا جا سکتا ہے؟

دہشت گردوں کے سرمائے تک پہنچنا

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء سے کافی پہلے امریکی حکومت اور جی سیون کے ممالک باہمی تعاون سے ناجائز دولت اور اس کی ترسیل کے لیے بینکوں کے کردار پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ تاہم اس حوالے سے کیے جانے والے بہت سارے اقدامات جزوی تھے اور سچ تو یہ ہے کہ امریکی وزارت خزانہ اور کانگریس دونوں اس لحاظ سے نیم دلی کا شکار تھے۔

۲۰۰۰ء میں کالے دھن کے خلاف قانون کی منظوری تعطل کا شکار رہی کیونکہ بینکوں کی طرف سے

اس کی مخالفت ہوئی۔ سینیٹ کی بینکاری کمیٹی کے چیئر مین فل گرام نے اس قانون کی مخالفت اس بنیاد پر کی کہ اس سے بینکوں کی رازداری متاثر ہوگی یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اسی بل کی حمایت تب کی جب کمیٹی نے اس کی منظوری دی۔ یہی حال سیکرٹری خزانہ پال اونیل کا تھا جنہوں نے کالے دھن کے حوالے سے تنظیم برائے اقتصادی تعاون وترقی (OECD) کے ان اقدامات کی مخالفت کی جو وہ ایک خاص نظام الاوقات کے اندر لینا چاہ رہی تھی۔ اس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ OECD کا متعین عرصہ التواء کا شکار رہا اونیل کا استدلال یہ تھا کہ اس تنظیم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آزاد ممالک کو ٹیکس قوانین اور نظام کا سبق پڑھائے۔

اا ستمبر کے واقعات نے اس بحث کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ امریکی حکومت نے بیرونی اثاثہ جات کے تعاقب کے نام سے ایک ٹاسک فورس قائم کی ہے جس کے ذریعے دہشت گردوں کے اثاثہ جات کی بیخ کنی کی جائے گی۔ صدر جارج بش نے ۲۴ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ایک انتظامی حکم کے تحت دہشت گردی کا ارتکاب اور حمایت کرنے والوں کی جائدادوں کی ضبطی اور ان سے مالی معاملات پر پابندی عائد کی ہے اس حکم کی زد میں امریکہ کے اندر ۲۷ اشخاص اور ادارے آئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اپنی قرارداد نمبر ۱۳۶۸ میں دہشت گردی کی تمام اقسام کے خلاف سخت ترین الفاظ میں جنگ کرنے کا اعلان کیا ہے۔

کالے دھن کے حوالے سے نئے قوانین کے تحت وفاقی حکام کو یہ اختیار مل گیا ہے کہ وہ بیرونی جمع شدہ رقم کے منبع کے بارے میں تفتیش کریں جو بدعنوانی کے ذریعے حاصل کی گئی ہے۔ مزید برآں یہ قوانین امریکی بینکوں کو ان جعلی بینکوں سے معاملہ کرنے سے روکتے ہیں اور ان سے امریکہ میں رائج حوالہ نظام پر کڑی نظر رکھی جارہی ہے۔ جی سیون اور دیگر دوستوں سے تعاون بڑھایا جارہا ہے تاکہ آپس میں اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں یعنی عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے ساتھ ناجائز دولت کی ترسیل کو روکا جاسکے۔

دوسری طرف دہشت گردوں کو سرمائے کی فراہمی کے حوالے سے امریکی حکومت بعض دوسرے طریقے بھی آزما رہی ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک نے سرمایہ کی غیر قانونی منتقلی کے ضمن میں امریکی حکومت کو تعاون کی یقین دہانی کرائی ہے۔ کیا یہ تمام اقدامات کافی ہیں۔ شاید نہیں لیکن ان سے قابل لحاظ حد تک مدد

ضرور ملے گی۔

کرنے کا کام

امریکی سینیٹر چارلس شومر نے اکتوبر ۲۰۰۱ء کو بینکاری کمیٹی کے اجلاس میں تجویز پیش کی ہے کہ امریکی شہریوں اور اداروں کو ٹیکس چوری کے لیے محفوظ بینکوں سے معاملہ کرنے سے روکا جائے کیونکہ مذکورہ بینکوں کے رازداری کے قوانین امریکی تحقیقاتی اداروں سے تعاون میں سدراہ بنے ہوئے ہیں۔ بینکاری کمیٹی کے ایک اور رکن گرام نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکہ کو دوسرے ممالک کے لیے بینکاری کے قوانین مرتب کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

امریکہ کے مجوزہ قوانین کی مخالفت امریکن بینکنگ ایسوسی ایشن (ABA) نے بھی کی ہے جس نے سینیٹ کی بینکاری کمیٹی کے سامنے مجوزہ بل کو اس لیے ناموزوں قرار دیا کہ منظوری کی صورت میں غیرملکی کھاتے داروں پر کڑی نگرانی کرنی ہوگی جبکہ ABA کے خیال میں امریکی بینک پہلے ہی سخت نگرانی پر عمل پیرا ہیں۔

امریکی محکمہ خزانہ پیسے کے مقابلے میں سخت ترین اقدامات کررہا ہے تاہم اسے ابھی تک یقین نہیں ہے کہ ٹیکس چوری کے محفوظ مقامات کے حوالے سے کارروائیوں میں یہ کہاں تک دخیل ہوسکتا ہے۔ گرام کی طرف سے شومر کی ترامیم کی مخالفت اس ہچکچاہٹ کا بین ثبوت ہے۔ دوسری طرف نجی لابی کی وہ مخالفانہ مہم جو وہ تنظیم برائے اقتصادی تعاون OECD کی طرف سے ناجائز سرمائے اور ملوث ممالک پر اقتصادی پابندیوں کے خلاف چلارہی ہے، بھی مجوزہ امریکی قوانین کے راستے میں رکاوٹ بن رہی ہے۔

ٹیکس چوری کے حامل ممالک کی حاکمیت (sovergnity) کا احترام اور دباؤ بڑھانے میں ناکامی کی صورت میں ناجائز سرمائے کے خلاف کوششیں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتیں۔ اگر اس محاذ پر واقعی کامیابی مقصود ہو تو رازداری کے قوانین کے خاتمے اور دیگر امور میں عدم تعاون کرنے والے ممالک کو سزا دینی ہوگی۔ امریکہ اس نوعیت کی سزائیں دینے میں کہاں تک کامیاب ہوسکتا ہے؟ یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا حاکمیت کو دیگر چیزوں پر اولیت دینا ضروری ہے کہ جزیرہ ناورو بغیر کسی رکاوٹ کے جعلی بینکوں

رجسٹر کرتا پھرے؟

امریکہ اور سات بڑے صنعتی ممالک نے اگر جنگ جیتنی ہے تو انہیں دہشت گردوں کے سرمائے کے بہاؤ کو روکنا ہوگا اس سلسلے میں انہیں عدم تعاون کا مظاہرہ کرنے والے ممالک کے خلاف سختی برتنی ہو گی۔

سرمائے کے اس بہاؤ کو روکنے میں رازداری کا مسئلہ سامنے آ سکتا ہے۔ یہ مسائل خود امریکہ اور دوسرے ممالک میں سر اٹھا سکتے ہیں اس لیے کانگریس دہشت گردی کے خلاف اقدامات میں اس پہلو پر خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ چنانچہ جہاں رازداری کے خلاف اقدامات محدود ہونے چاہئیں وہاں رازداری کا احترام بھی محدود ہونا چاہیے۔

جن ممالک میں سے رازداری کے بہانے سرمایہ حرکت کرتا ہے وہاں کے حکام بدعنوان ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دہشت گردی کے خلاف مہم کی زبانی حمایت تو کرتے ہیں لیکن مشترکہ کوششوں میں عملی تعاون کے لیے تیار نہیں۔ بہت سارے ممالک ایسے بھی ہیں جو انتظامی عدم استطاعت کے سبب موثر طور پر خفیہ سرمائے کا کھوج نہیں لگا پاتے۔ جی سیون کے ممالک اس حوالے سے مشترکہ تعاون کے امکانات پر کام کر رہے ہیں لیکن گروپ کو ان ممالک میں کارروائیاں کرنے میں مشکلات پیش آ سکتی ہیں جن کی انتظامی استعداد کار (capacity) ان سے کم ہے۔

سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ دہشت گردوں کو ملنے والے سرمائے کی مقدار دیگر جائز و ناجائز ذرائع کے لیے منتقل کیے جانے والے سرمائے کے مقابلے میں کم ہے۔ دوسرا یہ کہ منشیات اور دیگر غیر قانونی کاموں کے لیے سرمائے کے بہاؤ کو دہشت گردوں کی ترسیل زر سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

دہشت گردوں کو فراہم کیے جانے والے سرمائے کا سراغ اور اس کی ترسیل کو روکنا از بس ضروری ہے۔ اس کے بارے میں کامیابی اس طرح بھی مشکل ہے اگر اہم ممالک تعاون میں نیم دلی کا مظاہرہ کریں۔ چونکہ سرمائے کی حرکت ایک سے زیادہ ذرائع سے ممکن ہے اس لیے سراغ رسانی اور انسداد کے اقدامات خواہ کتنے بہترین کیوں نہ ہوں فروگزاشت کے امکانات موجود رہیں گے۔ دنیا بھر کے بدعنوان کردار اس مہم میں روڑے اٹکائیں گے۔ توقع تو یہ ہے کہ بہت سارے ممالک اپنی نااہلی کی وجہ سے آگے

نہیں جا سکیں گے تاہم جزوی کامیابی بھی دہشت گرد کارروائیوں کے لیے فراہم کیے جانے والے سرمائے کے سوتے بڑی حد تک خشک کر سکتی ہے۔

[سڈنی وینتراب، آسٹن میں یونیورسٹی آف ٹیکساس میں ڈین رسک پروفیسر امریطس ہیں۔]

مجاہدین سے ملاقات

جیسیکا سٹرن*

تلخیص: ڈاکٹر فخر الاسلام

گزشتہ جون کے مہینے میں مجھے لاہور کے ایک انتہا پسند مذہبی سکول (مدرسے) جامعہ منظور الاسلامیہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ پاکستان ایک غریب ملک ہے اور یکے بعد دیگرے بدعنوان حکومتوں نے اس کی حالت مزید ابتر کر دی ہے۔ اکثر دیہاتی علاقوں میں مفت سرکاری سکول میسر نہیں۔ دوسری طرف دینی مدارس میں غریب طبقے کے بچوں کو تعلیم، خوراک اور رہائش کی مفت سہولتیں فراہم کی جاتی ہے اور اس طرح یہ مدارس ایک بنیادی اور اہم ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ پاکستان میں ہزاروں مدارس ہیں جہاں زیر تعلیم طلباء عام طور پر قرآن سیکھتے ہیں۔ مغرب جدید معاشرے میں رہنے کے لیے جن مضامین کو ضروری خیال کرتا ہے (ریاضی، سائنس اور ادب) وہ یہاں نہیں پڑھائے جاتے یا بہت کم پڑھائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے مدارس جہاد کی تبلیغ کرتے ہیں۔ پاکستانی حکام کے مطابق ۱۰ تا ۱۵ فیصد مدرسے انتہا پسندانہ نظریات کے حامل ہیں۔

جامعہ منظور الاسلامیہ کے مہتمم پیر سعید اللہ خالد ہیں۔ انہوں نے ایک بڑے کمرے میں مجھ سے ملاقات کی جس میں کتب کی الماریاں رکھی گئی تھیں لیکن ان میں کتابیں موجود نہ تھیں۔ اس مدرسے میں ۴۵۰ طلبہ اقامتی ہیں جبکہ ۱۰۰ طلبہ قرب و جوار سے روزانہ آتے ہیں۔ پیر خالد نے بتایا کہ ان طلباء کی اکثریت ان غریب گھرانوں سے تعلق رکھتی ہے جو ان کے تعلیمی اخراجات پورے نہیں کر سکتے ہیں۔ میں نے پیر خالد سے پوچھا کہ وہ کس طرح اس مدرسے کے سربراہ بنے؟ انہوں نے کہا کہ وہ بھی ایک مدرسے کے پڑھے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ان کی پسندیدہ کتاب کون سی ہے؟ انہوں نے جواب

* Jessica Stern, "Meeting with the Muj", *Bulletin of the Atomic Scientists*, Jan/Feb 2001, pp. 42-50

دیا ''قرآن بہترین ناول ہے''۔ میں نے ان سے مقبول صوفی گلوکار نصرت فتح علی خان کے بارے میں پوچھا کہ کیا وہ انہیں جانتے ہیں، تو انہوں نے کہا ''مجھے موسیقی کی ضرورت نہیں، موسیقی ان کی ضرورت ہے جو اس کے دلدادہ ہیں''۔ پھر میں نے سائنس کے حوالے سے سوال کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا وہ البرٹ آئن سٹائن کو جانتے ہیں؟ اس سوال کا طویل جواب دیتے ہوئے آپ نے کہا ''نہیں مجھے سائنس کی کوئی ضرورت نہیں، میں تمہیں بیٹی کی طرح سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ تم سائنس کا بہت زیادہ یقین رکھتی ہو۔ سائنس ایک حقیر چیز کو قیمتی بناتی ہے جیسے دھات سے ہوائی جہاز۔ کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ تمہیں بھی قیمتی بننا چاہیے؟ انسان کے قیمتی بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس ہستی کے اصولوں کی اتباع کرے جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ انسان جہاد سے بیش قیمت بن سکتا ہے۔ موت کا علم کسی کو نہیں اس لیے تمہیں اسلام کی طرف سفر کا جلد از جلد آغاز کرنا چاہیے''۔

میں پیر خالد کے مدرسے میں دو ایسے طلباء سے بھی ملی جو مجاہدین کے بجائے ڈاکٹر بننا چاہتے تھے ان کی خواہش پر پیر خالد بوکھلا کر کہنے لگے ''انہیں یہاں آئے ہوئے ابھی چند مہینے ہوئے ہیں۔ جب میں سال بھر کے لیے ان پر کام کروں گا تو یہ بھی مجاہدین بننا پسند کریں گے''۔ مجھے پیر صاحب کی بات کا مکمل یقین ہے کیونکہ جس رعب اور دبدبے کے وہ مالک ہیں یہ بے چارے طلباء ان کی رضا کی خاطر سب کچھ کریں گے۔

اگرچہ بعض مدارس کا دعویٰ ہے کہ وہ جامعہ منظور الاسلامیہ کے مقابلے میں وسیع تر نصاب پڑھا رہے ہیں لیکن ان کے اساتذہ کو بمشکل تعلیم یافتہ کہا جا سکتا ہے۔ ایک اور مدرسے میں ایک استاد جس سے میں نے انٹرویو کیا وہ ریاضی میں جمع تو کر سکتے تھے لیکن ۷ کو ۸ سے ضرب نہ دے سکے۔ کئی عشرے پہلے پاکستان کے مشہور مذہبی سکالر اور جماعت اسلامی کے بانی ابوالاعلیٰ مودودی نے خالص مذہبی بنیادوں پر دی جانے والی تعلیم کے منفی مضمرات سے لوگوں کو متنبہ کیا تھا۔ آپ نے کہا تھا ''جو لوگ تعلیم کے صرف مذہبی پہلو کا انتخاب کرتے ہیں وہ دنیاوی مضامین سے از خود ناواقف ہو رہے ہیں یوں وہ لوگوں کو درپیش جدید سیاسی مسائل کا حل پیش کرنے سے قاصر ہیں''۔

ہر چند کے مودودی کے یہ مشاہدات مجھے معقول لگ رہے تھے لیکن کئی مدارس کے سربراہوں نے

مجھے ٹوکتے ہوئے صرف سائنس اور ریاضی پر مبنی میرے مشاہدات سے اتفاق نہیں کیا۔ دار العلوم حقانیہ کے سربراہ مولانا سمیع الحق نے کہا کہ پاکستان میں جو لوگ مدارس کے نصاب میں وسعت کی بات کرتے ہیں وہ مغرب کے ساتھ محض ایک ''سفارتی کھیل کھیل رہے ہیں''۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ امریکہ نے ہماری فوج کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ ہماری فوج اسلامی ہے اور وہ مدارس کی وفادار ہے۔ انہوں نے کہا ''یہ پہلا موقع ہے کہ میں کسی غیر ملکی کے سامنے سچ کو طشت از بام کر رہا ہوں''۔

رسد کی لکیر (supply line)

پر تشدد مذہبی انتہا پسندی پر تحقیق کے سلسلے میں گزشتہ دو سال کے دوران میں نے دنیا بھر کے عیسائی، یہودی، ہندو اور مسلم مسلح گروہوں سے انٹرویو کیے ہیں۔ پچھلے جون کو میں جنوبی ایشیا آئی تا کہ پاکستانی مقبوضہ اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کے درمیان خون ریز کنٹرول لائن کو دیکھ سکوں۔ میرا ارادہ تھا کہ مجاہدین سے ملاقات کر کے ان سے پاکستانی مدارس کے بارے میں معلوم کر سکوں۔ یہ مدرسے کب سے ایسے لڑکوں کو تیار کرتے ہیں جو خدا کے نام پر موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔

میں نے کشمیر میں جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے ''شہداء'' کے خاندانوں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ گزشتہ دو سال کے دوران میں مجاہدین سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں کہ وہ کیا عوامل ہیں جو انہیں بظاہر ہارتی ہوئی جنگ میں توپوں کا چارہ بنا رہے ہیں؟

پاکستان کی سنی فرقہ پرست تنظیم سپاہ صحابہ کے رہنما مجیب الرحمٰن انقلابی نے کہا ہے کہ ''آخر کار امریکہ نے یہ معلوم کر ہی لیا کہ یہ مدارس جہاد کے اڈے ہیں تب ہی تو وہ پاکستان پر ان مدارس کو بند کرنے کا دباؤ بڑھا رہا ہے لیکن اس سے کام نہیں چلے گا''۔

انہوں نے کہا کہ ''مدارس جہاد کے لیے رسد کی لکیر ہیں۔ جہاں بھی ریاست مدارس پر قابو پا لیتی ہے، جیسے مصر اور اُردن میں، وہاں جہاد کی آواز خاموش ہو جاتی ہے۔ پاکستان اور افغانستان وہ ممالک ہیں جہاں مدارس میں جہاد کی تبلیغ ممکن ہے۔ امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ اور ایمل کانسی کا سی آئی اے کے صدر دفتر پر ہلہ بول دینا امریکہ کی اس پالیسی کا ردعمل ہے جو وہ پوری دنیا پر اپنا عالمی نظام مسلط کرنا چاہتا

ہے۔ امریکہ جہاد کوختم کرنا چاہتا ہے لیکن اس کی اس کوشش سے دہشت گردی مزید بڑھے گی۔ ہم غیر ملکیوں کو بھی اس مقصد کے لیے تربیت دے رہے ہیں کہ وہ اپنے ممالک میں اسلام کی تبلیغ کرتے ہوئے جہاد برپا کریں۔ ہم اپنے نصاب میں تبدیلی کر کے امریکہ کی خواہش کبھی پوری نہیں کریں گے"۔

بیٹوں کا عطیہ

جن گھروں کے بیٹے شہید ہو جاتے ہیں ان کا کیا حال ہوتا ہے؟ اکثر ماؤں نے مجھے بتایا کہ انہیں اس بات سے خوشی ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو جہاد کے لیے وقف کر دیا۔ اس لیے کہ ان کے بیٹے اگلے جہاں میں ان کے کام آئیں گے جو اصل زندگی ہے۔ ایک شہید کے والد قربان حسین نے کہا:

> "جو اپنی جان اللہ کے راستے میں قربان کرتا ہے وہ زندہ جاوید ہوتا ہے اور جنت میں اپنے خاندان کے ستر افراد کے لیے جگہ حاصل کرتا ہے"۔

جن خاندانوں کے بچے شہید ہو جاتے ہیں وہ معزز بن جاتے ہیں۔ قربان حسین نے کہا "اب تو ہر کوئی میری عزت کرتا ہے کہ میں ایک شہید کا باپ ہوں۔ جب کسی گاؤں میں کوئی شہید ہوتا ہے تو اس سے دیگر والدین کو حوصلہ ملتا ہے اور وہ اپنے بچوں کو جہاد میں شامل کراتے ہیں۔ یوں پورے گاؤں میں جوش و خروش پیدا ہوتا ہے"۔

شہداء کے خاندانوں کی کفالت کے لیے تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک تنظیم شہدائے اسلام فاؤنڈیشن کو جماعت اسلامی نے قائم کیا۔ اس تنظیم کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۹۵ء سے لے کر اب تک اس نے پاکستان میں ۱۲ملین روپے خرچ کیے ہیں۔

میں ایک خاندان سے ملنے ایک ایسے علاقے میں گئی جہاں نکاس کی نالیاں کھلی تھیں لیکن سیمنٹ سے بنا ہوا نیا مکان فاؤنڈیشن کی مدد سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس سے قبل یہ مکان گارے سے بنی ہوئی ایک جھونپڑی پر مشتمل تھا۔ اس گھر کا ایک فرزند ظفر اقبال جب کشمیر میں شہادت کے رتبے پر فائز ہوا تو فاؤنڈیشن نے نہ صرف یہ کہ اس کے والد حبیب اقبال کا کافی سارا قرض ادا کیا بلکہ شہید کے والد کے لیے کاروبار کا انتظام بھی کیا۔ اب گاؤں میں ان کی اپنی دو دکانیں ہیں۔

ظفر اقبال شہید کا جنازہ کشمیر میں آٹھ ہزار افراد نے پڑھا۔ اس کی والدہ نے مسکراتے ہوئے نئے مکان کو دیکھا اور کہنے لگی ''اللہ ہماری مدد کر رہا ہے''۔ اس کے شوہر نے اپنے ۱۰ سالہ بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ انہیں بھی اللہ کے حوالے کریں گے۔ انہوں نے بتایا کہ مذکورہ بچہ سرکاری سکول میں پانچویں جماعت تک پڑھنے کے بعد دار العلوم میں داخلہ لے گا وہاں اسے ذہنی اور جسمانی طور پر جہاد کے لیے تیار کیا جائے گا۔ میں نے بچے سے پوچھا کہ وہ بڑا ہو کر کیا بنے گا؟ ''مجاہد'' اس نے جواب دیا۔

افغانستان سے تعلق

پاکستان میں جہادی کلچر فروغ پا رہا ہے۔ اس کے ڈانڈے ۱۹۸۰ء کے عشرے میں افغانستان میں شروع ہونے والی خانہ جنگی سے ملتے ہیں جب امریکیوں نے روسیوں سے لڑنے کے لیے مجاہدین کو تربیت دینا شروع کی۔ پاکستان کے ایک دانش ور اقبال احمد (مرحوم) نے کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا:

> ''سوویت افواج ۱۹۸۹ء میں افغانستان سے واپس چلی گئیں لیکن جہاد کا جو تصور بیسویں صدی میں دھندلا چکا تھا وہ دوبارہ زندہ ہو گیا''۔

افغان مجاہدین کو مالی اور جنگی تربیت دے کر امریکہ نے وہ کچھ کیا جو آج اس کی سالمیت کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے۔ اقبال احمد نے ۱۹۹۹ء میں لکھا:

> ''اسلحہ اور منشیات کے تاجروں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہ اس کا حصہ بن گئے اور خدا، بندوق اور سونے کے نام پر تجارت کرنے والے ایک غیر رسمی رشتے میں منسلک ہو گئے''۔

۱۹۸۰ء کے عشرے سے لے کر اب تک جہاد لاتعداد پاکستانیوں، عربوں اور افغانوں کا فلسفہ حیات بن چکا ہے۔ اسلحہ کی تجارت ویسے بھی منفعت بخش تھی کہ جہاد کشمیر نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔ پاکستانی حکومت مداخلت کی بجائے تجاہل (عارفانہ) سے کام لے کر جہادی کلچر کو فروغ دے رہی ہے۔ اگرچہ حکومت مذہبی استحصال کے خطرناک مضمرات سے لوگوں کو متنبہ کر رہی ہے لیکن جنرل مشرف نے پاکستانی نوجوانوں کی تربیت اور انہیں جہاد پر بھیجنے کے سلسلے میں جہادی تنظیموں اور مدارس کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔

پاکستان میں فرقہ وارانہ تشدد کو ابھارے بغیر کشمیر کا جہاد فروغ نہیں پا سکتا کیونکہ دو تحریکیں ایک دوسرے کے ساتھ مکمل طور پر مربوط ہیں یعنی ہندوؤں کے خلاف کشمیر میں جہاد اور پاکستان میں شیعوں کے خلاف جہاد کی تحریک۔ گزشتہ دس سالوں میں فرقہ پرست دہشت گردوں نے (سابق) وزیر اعظم نواز شریف پر قاتلانہ حملے کے علاوہ ہزاروں پاکستانیوں کو قتل اور مجروح کیا ہے۔

مجیب الرحمن انقلابی نے بتایا کہ پاکستان میں سپاہ صحابہ کو دیوبندی مکتب فکر کے مدارس پر گہرا اثر و نفوذ حاصل ہے۔ ان کے مطابق دیوبندی مدارس جہاد کشمیر میں مصروف مجاہدین کی بڑی تعداد کو فکری تربیت فراہم کر رہے ہیں۔ پاکستان کے مشہور فرقہ پرست دہشت گرد ریاض بسرا نے مفروری کا زیادہ وقت ان افغان کیمپوں میں گزارا جہاں کشمیری مجاہدین کو تربیت دی جاتی تھی۔ نواز شریف پر قاتلانہ حملے کے الزام میں پکڑے جانے والے ملزموں کو حرکت المجاہدین نے افغان صوبہ خوست میں تربیت دی تھی۔ جون کے مہینے میں میری ملاقات سپاہ صحابہ کے ایسے سابق کارکنان سے ہوئی جو اس تنظیم کو چھوڑ کر جہاد کشمیر کے لیے برسر پیکار تنظیموں میں شامل ہوئے تھے۔

جہادی تنظیموں کی تعداد کے بارے میں متضاد تخمینے سامنے آتے ہیں تاہم بہت سے امریکی، پاکستانی اور بھارتی ماہرین کا خیال ہے کہ ہزار ہا تربیت یافتہ مجاہدین کسی بھی وقت کشمیر جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ بھارتیوں کو یقین ہے کہ کشمیر کے اندر یہ تعداد ۲ سے ۴ ہزار تک ہے۔ ہندوستانی حکومت کا کہنا ہے کہ گزشتہ عرصے میں یہ مجاہدین زیادہ تربیت یافتہ اور پرتشدد بن گئے ہیں۔ وہ اس طرح کہ اب وہ بندوق کی بجائے ریموٹ کنٹرول سے بموں کے دھماکے کرتے ہیں اور وائرلیس سسٹم کے ذریعے آپس میں مسلسل رابطہ رکھے ہوئے ہیں۔ (مجھے وائرلیس سسٹم کے بارے میں علم دو مجاہدین کے والدین کے ذریعے ہوا جو ابھی ابھی مظفر آباد سے اپنے بیٹوں سے گفتگو کر کے آ رہے تھے)۔

مجاہدین کو ملنے والے اسلحہ اور تخریبی مواد کے ذرائع کسی کو معلوم نہیں۔ بھارتی حکام کہتے ہیں کہ اے۔ کے۔ ۴۷ قسم کی بندوقیں ۱۹ مختلف ممالک میں بنتی ہیں اور آتش گیر مادوں پر کوئی لیبل نہیں ہوتا جس سے بنانے والے ملک کی پہچان ہو۔

کشمیر میں برسر پیکار ایک پاکستانی تنظیم کے عہدیدار نے مجھے بتایا کہ کس طرح وہ جنگ میں

مصروف مجاہدین کو بسا اوقات خفیہ کارروائیوں پر مامور کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا:

''ہمارے لوگ دریائے راوی کے ذریعے آزاد جموں سے مقبوضہ جموں تیرتے ہوئے جاتے ہیں ایک عام مجاہد ۹ سے ۱۰ تک بھارتی سرحد پولیس والوں کو قتل کرتا ہے۔ پھر ہم اس مجاہد کو خوابیدہ (sleeper) بنادیتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ وہ جموں کے رہائشی علاقے میں مکان کرائے پر لیتا ہے اس کے بعد کوئی کام شروع کرتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ جموں کچھ عرصہ رہنے کے بعد عام طور پر یہ لوگ دہلی کا رخ کرتے ہیں جہاں وہ پنجابی ہندوؤں کا روپ دھار لیتے ہیں''۔

انہوں نے کہا کہ دہلی جانے والوں کی تعداد کا انحصار پاکستانی آئی ایس آئی کی مدد پر ہے۔ انہوں نے مزید تفصیلات بتاتے ہوئے کہا:

''ہمارے لوگوں کی حرکت اس قدر سائنسی ہے کہ بھارتی ایجنسی ان کی بو تک نہیں سونگھ سکتی۔ جب وہ دہلی پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو وہ غریب کشمیری مسلمانوں کو ڈھونڈ کر انہیں ان کے آئینی حقوق کے بارے میں بتاتے ہیں۔ یہ کشمیری جو عام طور پر مزدور ہوتے ہیں آٹھ چارپائیوں پر مشتمل کمرے میں رہتے ہیں۔ ہر آٹھ گھنٹے بعد کام کی شفٹ تبدیل ہونے کے بعد نئے مزدور اس کمرے میں آرام کرنے آتے ہیں۔ یوں اس چھوٹے کمرے میں کل ۲۴ افراد رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ ہمارے لوگ ان غریب کشمیریوں کی مدد کرتے ہیں۔ ان میں بعض کو اردو سکھاتے ہیں ان میں کچھ لوگ ہندو یا سکھ مذہب اختیار کر چکے ہوتے ہیں ہم ان کو مذہبی کتابیں دے کر انہیں دوبارہ مسلمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں''۔

مذکورہ عہدیدار نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا:

''یہ کام بہت مشکل ہے کیونکہ دنیاوی ترغیبات تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ ان کشمیریوں کو بہت کم پیسوں میں نوجوان راجستھانی لڑکیاں اور شراب میسر ہو جاتی ہے۔ اس ماحول کو وہ جنت سمجھتے ہیں، اس لیے وہ کشمیر کی غربت میں واپس جانے کو تیار نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ

کشمیر کی مدد کریں، رقم کمائیں اور اس میں سے کچھ پیسے کشمیریوں کی مدد کے لیے بھی بھیجیں۔ بعینہ اس وقت جبکہ ہندو قوم پرست بابری مسجد کے احاطے میں مندر بنانے کا اعلان کر رہے تھے ہمارے خفیہ مجاہدین کشمیری مسلمانوں کو منظم کرنے میں مصروف تھے"۔

جہاد یا دہشت گردی؟

پاکستان کے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کے بنیاد پرستوں کے بارے میں سخت رویے سے زیادہ ان کی حکومت کا ان عناصر سے تعلق نمایاں حقیقت ہے۔ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی دہشت گردی کے بارے میں جاری ہونے والی حالیہ رپورٹ پاکستانی حکومت کے اس دعوے کو باطل قرار دے رہی ہے کہ وہ جہادی تنظیموں کو مادی مدد نہیں دے رہی۔ اگرچہ نجی محفلوں میں بعض پاکستانی حکام یہ تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان جہادی تنظیموں کی کارروائیوں کے لیے سہولتیں ضرور فراہم کر رہا ہے جن میں کنٹرول لائن کے ذریعے بھارت کے زیر تسلط کشمیر میں داخل ہونا شامل ہے۔

اگر مشرف اعتدال پسند اسلام کو پاکستان کے مستقبل کا رہنما اصول بنانے میں واقعی سنجیدہ ہیں (جیسا کہ انہوں نے حالیہ نشری تقریر میں دعویٰ کیا ہے) تو انہیں اس حمایت سے دست کش ہونا پڑے گا۔ اب تک تو ایسا کرنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا انہیں بنیاد پرست مدارس کو نصاب کی تبدیلی اور پر تشدد جہاد کی تبلیغ واشاعت کی روک تھام پر مجبور کرنا ہوگا۔ اگرچہ ان کی حکومت نے مدارس کے خلاف کارروائی شروع کی ہے لیکن میں جتنے بھی لوگوں سے ملی وہ حکومتی اصلاحات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بعض پاکستانی حکام نجی محفلوں میں یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ پاکستان کو مجاہدین کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ہندوستان کو باور کرایا جا سکے کہ کشمیر کا فوجی حل ممکن نہیں۔

کنٹرول لائن پر متعین ایک پاکستانی کمانڈر نے کہا کہ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے ہندوستان کی روایتی افواج پاکستان سے کئی گنا زیادہ ہیں لیکن ان کے سپاہی ذہنی دباؤ کا شکار ہیں جس سے ان کا مورال گر رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ دوسری طرف مجاہدین اپنے مبنی برحق موقف کے سبب مضبوط تر ارادے کے حامل نظر آ رہے ہیں۔ اگرچہ کنٹرول لائن پر متعین بھارتی افواج کے مقابلے میں مجاہدین کی تعداد کافی کم ہے

تاہم مقابلہ دو بدو ہو تو مجاہدین ان سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ بھارتی افواج کا مجاہدین سے خائف ہونے کا خیال نہ صرف مجاہدین بلکہ پاکستانی فوجی حلقوں میں بھی عام ہے۔

مشرف ان مجاہدین کو دہشت گرد کی بجائے آزادی کے جنگجو قرار دے کر مغرب کے اس رویے کو مسترد کرتے ہیں جس کے تحت وہ جہاد کو دہشت گردی سے خلط ملط کرتا ہے تاہم اس طرز استدلال میں کئی خامیاں ہیں۔ کشمیر میں دراندازی ابھی تک اس خطے پر بھارتی قبضے کے عزم میں کمی نہیں لاسکی ہے بلکہ پاکستان کی طرف ان کا رویہ سخت تر ہوتا جارہا ہے۔ بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے اس وقت تک مشرف سے ملنے سے انکار کردیا ہے جب تک پاکستان مجاہدین کے تشدد کو ختم نہیں کرتا۔

گزشتہ جون میں ایک پاکستانی افسر نے مجھے بتایا کہ بنیاد پرست جہاد کی غلط تعبیر پیش کرتے ہیں۔ ان صاحب کے مطابق اسلامی دانشوروں کی بڑی تعداد حضرت محمدؐ کی تعلیمات کی روشنی میں روحانی جہاد پر زور دیتے ہیں جس کے مطابق اللہ کے احکام کی پیروی ''جہاد اکبر'' اور قتال ''جہاد اصغر'' ہے۔ ایک دانشور تو یہاں تک کہتا ہے کہ قرآن کسی بھی صورت میں انسان کو قتل کرنے سے منع کرتا ہے۔

انسانی حقوق کی تنظیمیں کہتی ہیں کہ ۱۹۹۰ء کے اوائل سے شروع حملوں میں ہندوستانی افواج اور کشمیریوں دونوں نے شہری آبادی کو نشانہ بنایا ہے۔ بھارت کے مطابق متعدد پاکستانی جو پکڑے گئے ہیں یہ اعتراف کرچکے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کے اندر کارروائیاں کیں۔ ان کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۳ء میں طفیل رشید راجپوت کو بمبئی کے مرکزی ریلوے اسٹیشن پر بم نصب کرتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔ ۱۹۹۷ء میں عبدالمتین کو حراست میں لے لیا گیا انہوں نے اقبال جرم کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۹۶ء میں جے پور سٹیڈیم میں دھماکہ اور اسی وقت آگرہ میں سویڈن کے ایک سیاح کا قتل انہوں نے کرایا تھا۔ متین نے یہ بھی انکشاف کیا کہ حرکت الانصار نامی تنظیم نے تاج محل آگرہ کو بم سے اڑانے کا منصوبہ بنایا تھا تا کہ اس کے ذریعے مسئلہ کشمیر کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کرائے۔ حقوق انسانی کی تنظیموں نے اپنی رپورٹوں میں لکھا ہے کہ جہادی گروہ کشمیر میں بسوں، دوکانوں اور دوسرے مقامات کو بموں سے نشانہ بناتے ہیں۔

جب جہادی تنظیمیں نہتے لوگوں کو نشانہ بنائیں تو کیا یہ دہشت گردی ہے؟ اس سوال کا جواب ہے

''ہاں'' کیونکہ اسلامی اور مغربی روایات دونوں یہی کہتی ہیں۔ قوانین جنگ کے مطابق جنگ اس وقت جائز ہو جاتی ہے جب امن کے حصول کے لیے بہتر ذرائع میسر نہ ہوں، نیز مقصد نیک ہو اور جنگ سے حاصل شدہ فوائد اس کے نقصانات سے زیادہ ہوں۔ اسلام اور مغربی روایات میں اس کا فیصلہ مجاز مقتدرہ کرے گی۔ ۱۹۴۰ء کے عشرے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کہا تھا کہ مجاہدین انفرادی طور پر جہاد کے اعلان کے مجاز نہیں۔

اسی طرح عالمی قوانین جنگ کا ایک اصول یہ ہے کہ محاصرہ کرنے والوں کا طریق کار ان کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو اور وہ نہتے لوگوں کو براہ راست نشانہ نہ بنائیں۔ اسلام کے جائز جنگ نظریے کا بھی یہی تقاضا ہے۔

تاہم جائز اہداف (legitimate target) کا تصور مجاہدین کے ہاں کافی وسیع ہے۔ ان کے مطابق ہندوستانی حکام اور ان سے تعاون کرنے والے کشمیری جائز اہداف ہیں۔ ظاہر ہے یہ تصور بین الاقوامی قانون کے منافی ہے۔ مزید برآں جب ان معاونین کو بازاروں اور بسوں میں نشانہ بنایا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں بے گناہ لوگوں کا مرنا یقینی امر ہے۔ واضح رہے کہ بے گناہوں کو نشانہ بنانے کا ارتکاب ہندوستانی افواج بھی کرتی ہیں۔

المناک چکر

دہشت گردی دنیا بھر میں نہ صرف پرانے قضیوں کی وجہ سے بلکہ ریاست کی طرف سے تعلیم اور دیگر سہولیات فراہم کرنے میں ناکامی کے سبب فروغ پا رہی ہے۔ اسی مسئلے کے حل کے لیے تنازعہ کشمیر کے حل کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ۱۹۸۰ء کے عشرے میں شروع ہونے والے جہادی کلچر کی بیخ کنی کرنی ہوگی۔ اس کلچر کو باقی دنیا سے ملنے والی مالی مدد سے مزید فروغ دیا جا رہا ہے۔

جہاد کے عمل میں جیتنے اور ہارنے والے دونوں موجود ہیں۔ فاتحین جن میں اسلحہ کے تاجر، جہادی تنظیموں کے رہنما اور تربیتی کیمپوں کے منتظمین شامل ہیں، کے لیے کم از کم یہ منافع بخش کاروبار ضرور ہے۔ امریکہ جس نے ۱۹۸۰ء کے عشرے میں جہاد کلچر کا بیج بویا تھا اب ضرور ان خطوط پر سوچ رہا ہوگا کہ

اس کا خاتمہ کیسے ہو۔ پاکستان کے نوجوانوں کو تعلیم میں معاونت امریکہ کی معقول سرمایہ کاریوں میں سے ایک ہوگی۔

اسی اثنا میں پاک بھارت تصادم جاری رہنے سے المناک چکر (cycle) مزید گہرا ہوگا۔ پاکستان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے بجٹ کا ایک چوتھائی سے زیادہ دفاع پر خرچ کرتا ہے اور ان کے پاس غریبوں کو تعلیم دلانے کے لیے بہت کم پیسہ بچتا ہے۔ اس کے نتیجے میں غریب لوگ اپنے بچوں کو مدارس بھیجتے ہیں جہاں وہ جہاد کا خطرناک اور پرتشدد تصور سیکھتے ہیں۔ ایک مجاہد نے کہا ''امیر اپنا پیسہ عطیے میں دیتے ہیں اور غریب اپنے بیٹے''۔

[جیسیکا سٹرن هارورڈ یونیورسٹی کے کینیڈی سکول آف گورنمنٹ میں لیکچرار هیں اور *The Ultimate Terrorist*, Cambridge, Mass: Harvard University Press, 1999 کتاب کی مصنفه بهی هیں-]

دہشت گردی سے نبرد آزما معاشی جنگجو

مرے ویڈ نبام*

ترجمہ: عبداللطیف الفت

۱۱ ستمبر کی دہشت گردی کے واقعات کے بعد متعدد پیش بین اپنی قلیل المیعاد اور طویل المیعاد توقعات کا ازسرِنو جائزہ لے رہے ہیں۔ بالعموم ان کا رجحان زوال کی طرف ہے۔ ان حالات کو نئے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

امریکہ معاشی اور مالی نقطۂ نظر سے اب بھی دنیا کی سپر پاور ہے۔ امریکی قوم کے دامن میں اپنے مقاصد اور اہداف کے حصول کے لیے بے مثال ذرائع موجود ہیں۔ نیز یہ کہ دہشت گردی کے حملوں کے دوران بھی اس کے بنیادی ڈھانچے کے تمام ستون یعنی بجلی، گیس، ریڈیو، مواصلات، بینک وغیرہ مؤثر انداز میں کام کرتے رہے اور جائے حادثہ کے قریب یا بعید ہونے کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملوں کا جو نقصان براہ راست پہنچا وہ نہ صرف ڈرامائی تھا بلکہ بھرپور بھی تھا (نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے گرد و پیش پہنچنے والے نقصان کا اندازہ ۴۰ بلین ڈالر ہے) لیکن اس حملہ کے جو اثرات سامنے آئے ان پر ہوائی سفر کے علاوہ جلد ہی قابو پا لیا گیا۔ امریکی شہریوں کی اکثریت نے اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔ لیکن اس کے بالکل برعکس امریکہ پر ان عدیم النظیر حملوں کے بالواسطہ نتائج بدستور ظاہر ہو رہے ہیں۔

ان اثرات کا ایک اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۱ء کے لیے امریکہ کی کل مقامی پیداوار (GNP) اپنی ممکنہ مقدار سے ایک فیصد کم ہوگی۔ یہ کمی تقریباً ۱۰۰ بلین ڈالر کی ہوگی۔ سب نہیں تو کچھ معاشی اثرات اور چیلنج نفسیاتی ہیں لیکن بقیہ بنیادی ڈھانچے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس صورت حال

*Murray Weidenbaum, "Economic Warriors Against Terrorism", *The Washington Quarterly*, Winter 2002, pp. 43--52.

کے نتیجے میں جو سوال ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ دہشت گردی کے امکانات کے پیش نظر کون سے نتائج دیرپا ہوں گے یا مستقبل میں ابھر کر سامنے آئیں گے۔

کلیاتی اقتصادی پالیسیاں (Macroeconomic Policies)

دہشت گردی کے خلاف جدوجہد ایک طویل المیعاد سلسلہ ہے۔ اس کے پیش نظر معیشت کو بھرپور انداز میں جاری رکھنا جبکہ عالمی مارکیٹ میں مقابلہ کا سلسلہ روز افزوں ہے، بہت اہم ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ نئے مقاصد کے حصول پر اخراجات بہت زیادہ ہوں گے۔ حالیہ برسوں میں عالمی معیشت میں جو باہمی انحصار کی صورت حال پیدا ہوئی ہے اس کی وجہ سے امریکی معیشت میں کسی قسم کی کمزوری دنیا بھر کی معیشت پر فوراً اثر انداز ہوتی ہے۔ امریکی برآمدات اور بیرون ملک سرمایہ کاری میں کمی کا مشرقی ایشیا اور لاطینی امریکہ کے معاشی نظام پر، جو پہلے ہی ڈانواں ڈول ہے، بہت زیادہ منفی اثر پڑے گا۔

۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد وقتی اثرات بھی کسی خلا میں نہیں پیدا ہوئے تھے۔ اس کے نتائج ایک ایسی معیشت پر جو اگرچہ عملاً انحطاط کا شکار نہ تھی لیکن روبہ تنزل ضرور تھی منڈھ دیے گئے۔ ان منفی اثرات کا اتنا بھرپور ہونا ضروری نہ تھا جتنے انحطاط کا عملاً یہ منفی اثرات باعث بنے۔ ۱۱ ستمبر سے پہلے معیشت کا مرکزی ستون صارفین کی طرف سے سرمایہ کا خرچ کرنا تھا۔ ان حملوں کے نتیجے میں بے یقینی کی کیفیت پیدا ہوئی جس میں یہ سوال شامل تھے کہ امریکہ کا فوجی ردعمل کیا ہوگا یا دہشت گردوں کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ یہ بے یقینی اس کے لیے کافی تھی کہ صارفین اپنی خریداریوں کا سلسلہ التوا میں ڈال دیں جس کے نتیجہ میں معاشی صورت حال فوراً زوال پذیر ہوگئی۔

خوش قسمتی سے وفاقی حکومت کے تمام کلیدی مالیاتی شعبوں نے جن میں فیڈرل ریزرو سسٹم، ٹریژری ڈیپارٹمنٹ اور سیکیورٹیز ایکسچینج کمیشن شامل ہیں ایک غیر معمولی باہمی تعاون اور اشتراک سے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔ چنانچہ The Fed ڈیپارٹمنٹ نے مالیاتی نظام کی رگوں میں حسابات کو جلد بیباک کرنے کے نظام کے ذریعے زندگی کی حرارت دوڑا دی۔ سرمایہ کاروں میں یہ یقین پیدا ہوا کہ معاشی نظم وضبط کے ذمہ دار ادارے، سٹاک ایکسچینج کی صورت حال کا باریک بینی سے جائزہ لے رہے ہیں اور

سٹاک مارکیٹ کے نظام کے کلیدی پرزوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ، مغربی یورپ، کینیڈا اور جاپان کے حکومتی پالیسی سازوں نے اپنی سرگرمیوں میں نہ صرف قریبی رابطہ رکھا بلکہ بہ یک وقت اپنی شرح سود میں بھی کمی کر دی۔

دنیا کے مختلف حصوں یعنی یورپ، جاپان، کوریا اور جنوب مشرقی ایشیا نیز مغربی نصف کرہ ارض کے طول وعرض میں بدقسمتی سے بہ یک وقت جو معاشی انحطاط روپذیر ہوا اس کے پیش نظر حکومتوں کے درمیان یہ رابطے بروقت ثابت ہوئے چونکہ معاشی ترقی کا کوئی نمایاں ساز وسامان موجود نہیں۔ خدشہ ہے کہ یہ ابتر معاشی حالات کم از کم سال ۲۰۰۲ء کے وسط تک موجود رہیں گے۔

جن لوگوں کے ہاتھوں میں معاشی معاملات کی باگ ڈور ہے ان کی سرکاری اور نجی شعبے دونوں میں بے یقینی کی کیفیت کا تعلق امریکہ کے دہشت گردی کے حملوں کے ردعمل سے ہے۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی بڑی فوجی کارروائی کے نتیجے میں معاشی سرگرمیوں کو ایک مہمیز مل جاتی ہے جو مختلف قسم کے ساز وسامان اور اس سے متعلقہ خدمات کے ٹھیکوں اور فوجی قوت میں اضافہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

اس کے برعکس بین الاقوامی دہشت گردی کے خلاف موجودہ جدوجہد ایک پیچیدہ عمل بنتا نظر آتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زیادہ تر کارروائیوں میں پہلے سے موجود فوجیں اور ساز وسامان استعمال ہوگا چنانچہ ان قوموں پر جو دہشت گردوں کو پناہ دیتے ہیں حملوں کا ردعمل معاشی حالات کی ابتری کا باعث بن سکتا ہے۔ چنانچہ فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں دفاع کی ضروریات کے لیے ساز وسامان اور خدمات کے بڑھتے ہوئے مطالبات سے پیدا ہونے والی مثبت تحریکات کا توازن بین الاقوامی تجارت اور معاشی سرگرمیوں میں واقع ہونے والے تعلق کی بنا پر بالکل الٹ سکتا ہے۔ ان منفی عوامل میں مشرق وسطیٰ سے تیل کی فراہمی میں تعطل اور اس کے نتیجے میں قیمتوں میں اضافے اور موجود سپلائی میں کمی بھی واقع ہوسکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ امریکہ کی حکمت عملی معاشی ردعمل کی بنا پر مرتب نہیں ہوگی اور نہ ہونا چاہیے۔ تاہم اس سلسلے میں پیدا ہونے والی تشویش کی بنا پر ناگہانی حالات سے نپٹنے کی منصوبہ بندی کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ ہر حالت میں یہ بے یقینی اس بنا پر پیدا ہونے کا امکان ہے کہ عوام کو خبر نہیں ہوسکتی کہ دہشت گردوں کا

اگلا نشانہ کب اور کہاں ہوگا اور اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ اس بے یقینی کے نتیجے میں اسی نوعیت کے واقع ہونے والے قومی حادثات کے بعد جو معاشی بحالی عموماً سامنے آتی ہے وہ تلپٹ ہو سکتی ہے۔

یہ حالات ایسی وسعت پذیر معاشی اور مالی پالیسیاں تشکیل دینے کی ضرورت کو اجاگر کر دیتے ہیں جن کے نتیجے میں اس مشکل دور میں معاشی ترقی ممکن ہو سکے۔ بہت بڑی حد تک اسی طرح کی پالیسیاں پہلے ہی سامنے آ رہی ہیں خصوصاً Fed کے معاملہ میں، جس نے بڑی تیزی سے لیکن بتدریج سود کی شرح کو کم کر دیا۔

ایک مستحکم اور مؤثر مالی پالیسی کی تشکیل ایک بہت مشکل عمل ہے۔ اس سلسلے میں بڑی حد تک اس سلسلے کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے مفاد پرست گروہوں کا مقابلہ کیا جائے جو ایسی پالیسیوں کی تائید چاہتے ہیں جو عظیم قومی مقاصد کے حصول میں مدد و معاون نہیں ہو سکتیں۔ بدقسمتی سے اس قسم کی مثالوں کی کمی نہیں ہے جن کا سلسلہ زرعی اعانتوں سے لے کر ٹیکسوں میں ایسی کمی تک پھیلا ہوا ہے جو معیشت کو بحال کرنے کے موجودہ عمل سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔

آئندہ کئی برسوں تک مالی پالیسیاں تشکیل دینے سے متعلق ایجنسیوں کو زائد وفاقی اخراجات کے تغیر پذیر سلسلوں (جس میں ترجیحی طور پر پیداواری مسائل شامل ہوں) نیز ٹیکسوں میں غور و فکر کے نتیجے میں تشکیل کی گئی کمی کی پالیسی پر اپنی توجہ مرکوز کرنی پڑے گی۔ اس قسم کے فیصلوں کے نتیجے میں بجٹ میں اضافی رقوم کی بجائے عارضی کمی ہو سکتی ہے کیونکہ اس قسم کی کمی سے فوری طور پر جمود کا شکار معیشت کے دور رس نتائج کے مقابلہ میں کم نقصان ہوگا۔

اس نوعیت کے فیصلوں سے جو روز افزوں اخراجات ہوں گے ان کی مدد سے دہشت گردی کے مقابلے، ملکی سیکیورٹی کے استحکام، امریکی مواصلات کے زمینی اور ہوائی ڈھانچے کی بہتری، نیز مین ہٹن کی تعمیر نو جیسے مناسب منصوبوں کے لیے رقم فراہم ہو سکتی ہے۔ ٹیکسوں میں کمی کو ابتدائی طور پر صارفین کی خریداری کی حوصلہ افزائی پر مرکوز ہونا چاہیے تاکہ معیشت تنزل کی کیفیت سے نکل سکے۔ بعد ازاں ٹیکسوں کے سلسلے میں ایسے فیصلے کیے جا سکتے ہیں جن کے نتیجے میں پیداواری سرمایہ کاری میں اضافے کی حوصلہ افزائی ہو۔ مثال کے طور پر نئی سرمایہ کاری پر انکم ٹیکس کی معافی کا قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس قسم کی پیش قدمی طویل المیعاد معاشی ترقی کے لیے بہت مؤثر ثابت ہوسکتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں تجارت اور صارفین کی طلب پر کسی بوجھ کے بغیر ملازمتوں کے مواقع کچھ عرصے میں بڑھ سکتے ہیں۔ امریکی معیشت میں فوری ترقی مختلف ذرائع سے ہوسکتی ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل اقدامات شامل ہیں:

- سود کی شرح میں بار بار کمی۔
- تباہ شدہ علاقوں کی مرمت اور تعمیر نو کے لیے معقول رقوم کی فراہمی۔
- وفاقی حکومت کی طرف سے سیکیورٹی سے متعلق معاملات اور دفاع کے لیے روز افزوں خریداری۔
- درآمدی تیل کی قیمتوں میں عالمی معیشت میں انحطاط کی بنا پر ہونے والی کمی۔
- تجارتی اداروں کی فہرستِ سامان میں کمی کا ازالہ۔

جزیاتی اقتصادی پالیسیاں (Microeconomic Policy)

دہشت گردی کے حملوں کے اثرات امریکی معیشت پر رفتہ رفتہ ایک بے ڈھنگ انداز سے مرتب ہو رہے ہیں۔ بعض صنعتوں پر ان کا اثر بالخصوص بہت گہرا مرتب ہوا ہے۔ ان میں ایرلائن، انشورنس کمپنیاں اور سفر سے متعلقہ کاروبار نمایاں ہیں۔ سیر وسفر کی صنعت تب سے بڑے، درمیانے اور چھوٹے کاروباری منصوبوں پر مشتمل ہے۔ ان میں کمرشل طیارہ سازی، ہوٹل، ٹریول ایجنسیاں، کاریں کرایہ پر دینے والی ایجنسیاں اور ہوائی اڈوں پر واقع ریستوران اور دکانیں شامل ہیں۔ ان شعبوں کی بے شمار فرموں کو اپنی کھوئی ہوئی کاروباری حیثیت بحال کرنے میں کافی وقت لگے گا۔ دیگر کاروبار خصوصاً مالی اداروں کے حالات سرمایہ کاروں کی واپسی کے ساتھ بحال ہو رہے ہیں۔ تاہم انوسٹمنٹ بینکنگ کے کاروبار کے بعض انتہائی منافع بخش حصے جن میں جدید کارپوریٹ سٹاک کو پبلک میں فروخت کرنے والے ادارے اور کاروباروں کے ختم ہو جانے یا حصول میں مدد دینے والی ایجنسیاں نمایاں ہیں، بے مثال انحطاط کا شکار رہیں۔

کچھ منفی اثرات مستقبل میں ظاہر ہوں گے۔ مثال کے طور پر جیسے جیسے انشورنس کمپنیاں کثیر مقدار

میں کلیم ادا کرنے کے لیے اپنے اثاثے فروخت کر رہی ہیں اور اپنے محفوظ سرمایہ میں کمی کر رہی ہیں قوم دیکھے گی کہ سرمایہ کاری میں کمی واقع ہوگی اور سرمایہ کے مروج صرف میں اضافہ ہوگا۔

نئے اور اہم منصوبوں کے لیے سرمایہ کی فراہمی میں تعطل طویل المیعاد معاشی بڑھوتری کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ چونکہ انشورنس کے نجی ادارے نئی پالیسیوں میں دہشت گردی کے نقصانات کو شامل کرنے سے جھجک محسوس کریں گے یا ان کے پاس زیادہ تر اس مقصد کے لیے مالی وسائل ہی نہیں ہوں گے، انشورنس کے شعبے میں حکومت کا حصہ بڑھ جائے گا۔ وفاقی حکومت کو بالواسطہ یا بلا واسطہ اس نوعیت کے خطرات کے ایک معتد بہ حصے کی ضمانت دینی پڑے گی۔

اس سارے معاملے کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ امریکی شہریوں نے معاشی اور تجارتی سطح پر بھی سامنے آنے والے نئے چیلنجوں کا مقابلہ بھرپور انداز میں کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ نجی شعبے میں ایسے طاقت ور محرکات موجود ہیں جن کے نتیجے میں موجودہ حالات میں کاروبار کی توسیع کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد ہو سکیں گے بشرطیکہ بیوروکریسی کے سرخ فیتے کی زائد از ضرورت پابندیاں ان کا گلا نہ گھونٹ دیں۔ اس کے برعکس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت کی طرف سے کمزور کاروباری شعبوں کو سہارا دینے کے لیے غیر معمولی امداد، وسائل کے ضیاع پر منتج ہو جائے نیز اس سے نجی کاروباری اداروں کو کوئی اچھا پیغام نہیں ملے گا۔

حالیہ اور مستقبل کی تمام تبدیلیاں امریکی کاروبار کے لیے منفی اثرات کی حامل نہیں ہوں گی۔ یہ بات تو واضح ہے کہ حکومتی اور نجی ادارے، ایسے آلات اور سسٹم خصوصاً بلند پایہ الیکٹرانک آلات جو دہشت گردی کے حملوں کا دفاع کر سکیں، خریداری میں اضافہ کی پیش بینی کر سکتے ہیں۔ ملٹری بجٹ میں نمایاں لیکن نپا تلا اضافہ متوقع ہے اور اس کا سلسلہ مستقبل میں بہت دور تک جاری رہے گا۔ اب جس عمل کو ''ہوم لینڈ سکیورٹی'' کا نام دیا جا رہا ہے روایتی فوجی انتظامات سے کہیں زیادہ وسعت کا حامل ہوگا۔ اس شعبے میں نئی صنعتوں کا قیام اور اضافہ بڑے پیمانے پر جنم لے رہا ہے ان میں امریکی شہریوں پر حیاتیاتی اور کیمیائی حملوں کے خلاف دفاع اور ملک کے بنیادی ڈھانچے خاص طور پر بجلی کی پیداواری اور سپلائی کے نظام اور اہم مواصلاتی سلسلے کا تحفظ شامل ہیں۔ اندرونی سکیورٹی کو استحکام بخشنے کا مطلب یہ ہوگا کہ نئے ملازمین

کے ذاتی پیش منظر کا گہرا جائزہ لیا جائے جس کے نتیجے میں ایک محدود لیکن خصوصی مہارت کی صنعت کو وسعت ہوگی اور کاروباری حلقوں کے بالائی اخراجات میں اضافہ ہوگا۔

اگر حالیہ واقعات کا امریکی شہریوں پر یہ اثر نہ پڑا کہ وہ زیادہ تر اپنے گھروں کے قریب ہی رہیں تو بہت بڑی حد تک بسوں اور ریلوں کے ذریعے سفر اور کاروں کا استعمال ہوائی سفر میں نمایاں کمی کو (یا کم از کم اس میں وقوع پذیر لازمی کمی کو) برابر کردے گا۔ روایتی کانفرنسوں کی جگہ ٹیلی مواصلات کانفرنسیں لے رہی ہیں چنانچہ ان کے متعلقہ آلات کے پروڈیوسر اور سپلائر اس صورت حال سے فائدہ اٹھا رہے ہیں کیونکہ ان کے ذریعے کسی کانفرنس کے شرکاء اپنے اپنے مقام پر رہتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کی کانفرنسیں روبرو بیٹھ کر ہونے والی کانفرنسوں کا سو فیصد نعم البدل نہیں بن سکتیں ان کا ایک اضافی فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کے وقت اور کمپنیوں کے اخراجات میں خاصی بچت ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود اس نئی ٹیکنالوجی سے محدود فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ بہت سے لوگ شاید اس پر تو راضی ہو جائیں کہ وہ جن لوگوں سے متعارف ہیں ان سے ٹیلی مواصلاتی ذرائع سے رابطہ کریں لیکن وہ ملازمت کے نئے امیدواروں اور نئی مصنوعات کے ایجنٹوں سے فون، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر یا ایسے دوسرے ذرائع سے بات چیت کرنے میں جھجک محسوس کریں گے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ کاروباری دنیا کی انتظامیہ کے چوٹی کے افراد کمرشل پروازوں کو چھوڑ کر اور ائرپورٹوں پر وقت کے زیاں سے بچنے کے لیے بڑے پیمانے پر کمپنیوں کے اپنے ملکیتی یا کرایہ پر حاصل کردہ ایگزیکٹو جہازوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ یہ چھوٹے جہاز چھوٹے چھوٹے ائیر پورٹ استعمال کرتے ہیں جو دہشت گردی کے حملوں کا مرکزی نشانہ نہیں ہیں اور ان کے اندر جانا یا باہر آنا آسان ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ امریکہ میں کاروبار کرنے کا خرچ، فزوں تر سکیورٹی کے اقدامات، انشورنس کے زائد پریمیم کی ادائیگی اور تیار شدہ مصنوعات اور ان کے پرزوں کی ترسیل میں تاخیر کی بنا پر بڑھ جائے گا۔ آخری بات کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے صنعت کاروں اور تقسیم کاروں کو اپنے ساز و سامان کی فہرست میں اضافہ کرنا ہوگا تاکہ عین وقت پر سامان پہنچانے کا اہتمام ہو سکے۔ حالیہ سالوں میں امریکہ کے کل جی ڈی پی کا تقریباً آٹھواں حصہ یعنی تقریباً ایک ٹریلین ڈالر کا سامان سالانہ ہوائی جہازوں کے ذریعے ارسال

کیا گیا۔اس سلسلے میں جو تبدیلی رونما ہو رہی ہے وہ خاصی بھرپور ہوگی۔

دہشت گردی کے خلاف جدوجہد کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ سرحدوں پر نقل وحرکت کو کم کیا جائے اور ایسی تجارتی اور مالی سرگرمیوں کو جن میں سامان قومی سرحدوں کے آر پار جاتا ہے، محدود کر دیا جائے اور ان میں کمی واقع ہو جائے۔دہشت گردی کی تنظیموں کی مالی امداد میں کمی کی کوششوں کا ایک لازمی مطلب یہ بھی ہے کہ سرمایہ کی بین الاقوامی منتقلی پر سخت پابندیاں عائد کر دی جائیں۔

نقصانات سے بچاؤ

دہشت گردی کے خلاف عالمی تعاون کی تشکیل اور اسے برقرار رکھنے کے اہم معاشی پہلو ہیں جن کے اثرات بیک وقت مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی۔اس سلسلے میں کم سے کم یہ کیا جا سکتا ہے کہ پالیسی ساز امریکہ کی مارکیٹوں تک رسائی کو محدود کرنے کی کارروائیوں سے اجتناب کریں جن کے نتیجے میں امریکہ سے اس سلسلے میں تعاون کرنے والے ملکوں کو جو دہشت گردی کے حملوں کے معاشی اثرات سے نپٹنے کی کوشش کر رہے ہیں نقصان پہنچے۔دنیا کے مختلف حصوں میں جو معاشی انحطاط پایا جاتا ہے اس کے پیش نظر امریکہ کی طرف سے تحفظ تجارت کی پالیسی جو عملاً انہیں معاشی طور پر تنہا کر دینے کے مترادف ہے انتہائی منفی اثرات کی حامل ہوگی۔

تحفظ تجارت کو نامنظور کرنے کی ضرورت سے بالا موجودہ حالات تجارتی بات چیت کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے ذریعے عالمی سطح پر اور علاقائی طور پر مغربی کرہ ارض میں فروغ دینے کا ایک اہم موقع فراہم کرتے ہیں۔تجارتی گفت وشنید کا ایک نیا دور یہ تاثر بھی پیدا کرے گا کہ امریکہ صحیح معنوں میں تجارت کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھتا ہے اور اس کے نتیجے میں ملک کے اندر اور بیرون ملک اعتماد کی فضا پروان چڑھے گی۔

یہ تاثر ان ترقی پذیر ملکوں کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے جنہیں اپنی برآمدات کے فروغ کے لیے مارکیٹ کے نئے مواقع کی ضرورت ہے تاکہ وہ معاشی حالات اور ترقیاتی سرگرمیوں کو پیش آمدہ مشکلات کا مقابلہ کر سکیں۔ان ممالک کی مصنوعات کے لیے امریکن مارکیٹ کے دروازے کھولنا بجٹ سے

ماورا اقدام ہوگا جس کے لیے امریکہ ٹریژری ڈیپارٹمنٹ سے منظوری لینا ضروری نہیں۔ اس کے علاوہ اس قسم کی روشن خیالی پر مبنی عالمی تجارتی پالیسی عالمی دہشت گردی کے خلاف جدوجہد میں تعاون کرنے والے ممالک کی حوصلہ افزائی کرے گی تاکہ وہ اس تعاون کو بھرپور بناسکیں۔

بہرحال نظر یہی آتا ہے کہ ۱۱ ستمبر کے بعد رونما ہونے والے واقعات مجموعی طور پر عالمی تعاون کے سلسلے کو سست کر دیں گے۔ متعدد امریکی اور غیر ملکی کمپنیاں رسد کے عالمی سلسلوں پر انحصار کا از سر نو جائزہ لیں گی بلکہ کچھ تو اس میں کمی کر دیں گی۔ بین الاقوامی سرحدوں کے آر پار افراد کی آمد و رفت اور سامان اور دیگر ضروریات کی ترسیل کی اہمیت میں کمی تو نہ ہوگی لیکن ان کی ترقی کی رفتار تکلیف دہ قسم کے قلیل المیعاد اقدامات کی تکمیل کے بعد حالیہ برسوں کے مقابلے میں نمایاں طور پر سست پڑ جائے گی۔ اندرونی معاشی حالت پر اس کے نتائج اہم ہوں گے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۰ء کے عشرے میں جب تجارت اپنے عروج پر تھی، امریکہ یورپ کی تقریباً ۲۲ فیصد برآمدات کا خریدار تھا۔ یہ بین الاقوامی تجارت اندرونی معاشی انحطاط کو ان ممالک کو منتقل کرنے کا ایک ذریعہ ہے جن سے امریکہ لین دین کرتا ہے کیونکہ تجارتی سامان کی مقدار اور اس سے متعلقہ خدمات میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

کاروبار کو اب کیا خطرات درپیش ہو سکتے ہیں اس بات کا ملکی اور صنعتی سطح پر تجزیہ کیا جائے تو ایک نئی چھوٹے پیمانے پر ابھرنے والی صنعت کا امکان ابھرتا ہے۔ اس قسم کے تجزیہ کے نتیجے میں صنعت کے شعبے کے کارپردازوں کے تصورات اور اقدامات میں متعدد تبدیلیاں رونما ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ توانائی اور معدنیات کی درآمد کو درپیش خطرات کے پیش نظر کاروباری طرز عمل ہی نہیں بلکہ حکومتی پالیسیوں میں بھی بھرپور تبدیلیاں ہوسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایندھن کو ہی لیجیے۔ اس سلسلے میں توانائی کے مروجہ اور نئے ملکی ذرائع کو محفوظ کرنے کے لیے کوششوں میں اضافہ متوقع ہے۔ امریکہ کو توانائی کی فراہمی کے نظام کو بآسانی نشانہ بنایا جاسکتا ہے چنانچہ اس کے تحفظ کے لیے ہمہ جہتی اور طویل المیعاد اقدامات کی ضرورت ہے۔

توانائی کو ذخیرہ کرنے کے لیے اس کی قیمتوں پر پابندیوں اور ٹیکس میں ایسی چھوٹ کو ختم کر دینا چاہیے جن کی بنا پر روایتی توانائی کی قیمتیں انکی اصل قیمتوں سے کم تر رہتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ امریکہ میں جو ایندھن استعمال ہوتا ہے اور اس کی فراہمی کے جو ذرائع ہیں ان میں تنوع کی حوصلہ افزائی

ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں چند خصوصی اقدامات یہ ہو سکتے ہیں کہ توانائی کی پیداوار اور تقسیم پر تحدیدی قواعد نرم کیے جائیں، غیر روایتی ایندھن کی پیداوار اور اس کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی جائے اور کینیڈا سے قدرتی گیس کے حصول کے لیے پائپ لائن تعمیر کی جائے۔

دھاتوں اور معدنیات کو ذخیرہ کرنے کا سلسلہ بھی نئے سرے سے شروع کرنا چاہیے۔ سرد جنگ کے دور میں یہ طرزِ عمل رائج رہا ہے جب حکومتی ادارے اور نجی کاروباری مراکز دونوں ہی ان ملکوں کے مستقبل کے بارے میں برابر تشویش کا شکار رہتے تھے، جو اس اہم مواد کی فراہمی کا بڑا ذریعہ تھے۔

دوررس اثرات

دہشت گردی کے خلاف طویل جدوجہد نئے کاروباری مواقع پیدا کرے گی اور ملک کی مجموعی معاشی سرگرمیوں پر اس کا مثبت اثر پڑے گا، بشرطیکہ جدید سرگرمیاں معیشت کی مالی حالت میں بہتری کا باعث بنیں اور ملازمت کے نئے مواقع پیدا کریں۔ سیکیورٹی اقدامات میں اضافہ سے امریکہ کی طرف نقلِ وطن کا سلسلہ بھی کم ہو جائے گا جس کے نتیجے میں متعدد امریکیوں کے لیے ملازمت کے مواقع بڑھ جائیں گے۔ اگرچہ اس سے مجموعی معاشی ترقی کی رفتار کم ہو جائے گی۔

نئی معاشی پالیسی کے حتمی اقدامات کی نوعیت جو ناگزیر ہوں یا جن کی ضرورت ہو، مختلف اقسام کی ہوگی اور اس کا انحصار اس دوران وقوع پذیر ہونے والے واقعات پر ہوگا۔ دہشت گردوں نے امریکہ پر حملوں کے سلسلے میں بڑی ذہنی اُپج اور نئے نئے طریقوں کی ایجاد کا مظاہرہ کیا ہے۔ دوسری طرف یہ لازمی نہیں کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا ردِ عمل بھی روایتی قسم کا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ان آئندہ پیش آنے والے واقعات کی بنا پر قومی پالیسی ایک مرتبہ پھر تبدیل ہو جائے جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ امریکہ کے مستقبل کا انحصار پیداوار کے نظام کی بنیادوں اور معاشی نظام پر ہے اور اس کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ سیکیورٹی کے لیے جو اقدامات ترتیب دے کر ان پر عمل کیا جائے ان میں اس طاقت ور عنصر کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

زیادہ بنیادی بات یہ ہے کہ دہشت گردوں کی نشان دہی اور تادیب بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم

۔ بڑے بڑے دہشت گردی کے پھیلائے ہوئے جالوں کی تباہی سے کاروباری ایگزیکٹوز اور صارفین دونوں میں کہیں زیادہ مثبت رویے جنم لیں گے۔ پھر اس کے نتیجے میں کہیں زیادہ مثبت معاشی تصورات ابھرنے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ ان سب سے بڑھ کر دہشت گردی کی سرگرمیوں کو ابھرنے سے روکنے کے لیے سب سے موثر اقدامات یہ ہوں کہ دنیا میں برپا نظریاتی کشمکش میں فتح حاصل کی جائے۔

نظریات کی معاشی جنگ

نظریاتی عالمی کشمکش میں موزوں ترین ہتھیار روایتی عسکری طاقت بلکہ اتحادوں کی تشکیل اور دہشت گردی کے لیے رقوم کی فراہمی کے خاتمے سے ماورا ہوگا۔ لوگوں کے دل و دماغ تسخیر کرنے کے سلسلے میں نجی سرمایہ کاری کے نظام کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہوگا جو فی الحال سامنے نہیں آرہا۔ اس سلسلے میں ایک مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ عالمی دہشت گردی کے جواب میں ایک اہم پہلو کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اس کا تعلق سمندر پار امریکی فرموں کے ان ممالک کے عوام سے میل جول سے ہے جہاں ان کا کاروبار ہے۔ بیرونی اقوام کی ایک کثیر تعداد امریکہ کے فوجی افسروں، سفارت کاروں اور سرکاری کارندوں سے کہیں زیادہ امریکہ کے کاروباری لوگوں اور ان کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہیں اور ان سے ان کا واسطہ پڑتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے غیر ملکی امریکہ کے بارے میں مثبت یا منفی رویہ امریکی منڈیوں کے لیے سامان بنانے والی فیکٹریوں میں کام کر کے یا امریکی فیشن کے ماہرین کے تیار کردہ کپڑوں کے گاہک کی حیثیت سے یا امریکی کلچر کی ترجمان سی ڈی استعمال کر کے یا امریکہ کی اجازت یافتہ کسی فرم کے ہاں کھانا کھا کر یا امریکی صنعت کاروں کا تیار کردہ کوئی معروف مشروب پی کر اپناتے ہیں۔ حتیٰ کہ امریکہ سے مایوسی کا اظہار بھی اس ٹیکنالوجی کے ذریعے کیا جاتا ہے جو بنیادی طور پر امریکہ ہی کی تیار کردہ ہے مثلاً انٹرنیٹ اور دیگر مواصلاتی ذرائع۔

چنانچہ ضروری ہے کہ ۱۱ ستمبر کے واقعات کے جواب میں ایک صحیح معنوں میں جامع اور دوررس پالیسی تشکیل دیتے ہوئے اس رویہ کو لازماً پیش نظر رکھا جائے جو بیرون ملک امریکی کاروباری حلقوں کی سرگرمیوں سے جنم لیتا ہے یا ان کے اثرات اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ اگرچہ زیادہ تر یہ اثرات غیر ارادی

طور پر پڑتے ہیں۔ اسی بات کو اگر زیادہ نرمی سے بیان کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ ''اگر آپ ہمیں جانتے ہیں تو ضروری نہیں کہ آپ ہم سے محبت بھی کریں''۔

چنانچہ تعلقات عامہ استوار کرنے کی ایک بھرپور مہم، جو بہر حال عوامی پالیسیوں میں برپا ہونے والی تبدیلیوں کے چیلنج کا عمومی اور فطری ردِعمل ہوتا ہے، چلائی جائے تو وہ اس قدر شفاف ہوگی کہ اس کے اندر مخفی عزائم صاف دیکھے جاسکیں گے اور اس کا الٹا اثر پڑے گا۔ اس کی بجائے ایسے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے جو غیر ملکی شہریوں کے امریکہ مخالف جذبات کو مثبت جذبات میں بدل سکیں۔ یہ اقدام ان ممالک میں اور بھی ضروری ہیں جو مالی طور پر پسماندہ ہیں اور مختلف قسم کے کلچر کے حامل ہیں۔

مثال کے طور پر ایسی امریکی کمپنیوں کو جو دوسرے ملکوں میں کارکنوں کو ملازم رکھتی ہیں ان حالاتِ کار اور ان کے معیار کا از سرِ نو جائزہ لینا چاہیے جو وہ یا ان کے کنٹریکٹر قائم کرتے ہیں۔ بیرون ملک کاروبار ہمیشہ ان اقدامات سے ہم آہنگ نہیں رہا جن کا امریکہ علمبردار ہے۔ اس سلسلے میں جو خلیج امریکہ اور دیگر ممالک میں حائل ہے اسے ٹیلی ویژن، فلمیں اور دیگر ذرائع ابلاغ زیادہ گہرا اور وسیع کر دیتے ہیں۔

کچھ روشن خیال کاروباری منتظمین نے عالمی طور پر ایسے ضابطہ کار وضع کیے ہیں جن کا مقصد مثبت حالاتِ کار پیدا کرنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان الزامات سے بچنا بھی کہ وہ بیگار لے رہے ہیں یا بچوں سے مشقت کرا رہے ہیں یا ماحول کو پراگندہ کر رہے ہیں۔ یقیناً یہ کمپنیاں کوئی خیراتی ادارے نہیں بن گئیں لیکن انہوں نے فوری منافع کے زیادہ سے زیادہ حصول کو ختم کر کے یہ تصور رائج کیا ہے۔ زیادہ خوش گوار حالاتِ کار مقامی آبادیوں سے طویل المیعاد تعلقات استوار کرنے میں مدد و معاون ہوتے ہیں جن سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ حالاتِ کار مقامی طور پر بھی رائج ہوتے ہیں اور بیرون ملک بھی۔

اس تجویز کے بارے میں خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ امریکہ کی ایسی مصنوعات جو بیرون ملک فروخت ہوتی ہیں اس طرح تیار کی جائیں کہ وہ نہایت معقول طور پر ان اقوام کے انفرادی ثقافتی اصولوں کے مطابق ہوں جہاں انہیں فروخت ہونا چاہیے۔ ایسی کوششوں کے کمپنیوں کی مارکیٹنگ کی حکمت عملی کو مؤثر بنانے کے سلسلے میں دور رس نتائج مرتب ہوں گے۔ اگر گہرا غور و فکر کیا جائے تو اس بات پر کوئی تعجب نہ ہوگا کہ بیرونی ممالک میں بہت سے لوگ امریکہ سے جانے والی بعض اشیاء کے ناقص

اخلاقی معیار کے بارے میں شاکی رہتے ہیں جو امریکہ کلچر کے نام پر برآمد کرتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ خود امریکہ میں بہت سے لوگ اسی طرح کا جذباتی ردعمل محسوس کرتے ہیں۔ اس ضمن میں امریکی حکومت کو کوئی مناسب رول ادا نہیں کرنا بلکہ ایسے نجی رضا کارانہ عمل کی ضرورت ہے جو بہت غور و فکر اور متوازن انداز میں ترتیب دیا گیا ہو۔

اس سلسلے کی عارضی فہرست بہت طول پکڑ سکتی ہیں۔ اصل نکتہ جو یہاں بیان کرنا مقصود ہے یہ ہے کہ عالمی سطح پر نظریاتی اور اقتدار کی کشمکش میں نجی کاروباری شعبہ نہایت کارآمد کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہ ایسی جنگ ہے جو لازمی طور پر غیر حکومتی تنظیموں اور افراد کے خلاف لڑی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں جوابی کارروائی کو خواہ وہ معاشی ہو یا غیر معاشی، حکومتی اداروں اور ان کے کارکنوں تک محدود کرنا ایک بڑی غلطی ہوگی۔

معاشی پس منظر کی اہمیت

امریکہ پر دہشت گردی کے حملوں کے نتیجے میں ایسے بہت سے عوامل سامنے آ گئے ہیں جو امریکی معیشت پر عموماً اور نجی سرمایہ کاری کے نظام پر خصوصاً نہایت اہم اور بعض حالات میں دور رس اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ عقلمندی کا تقاضا ہے کہ نہ تو مایوس ہوا جائے اور نہ ہی ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھا جائے بلکہ معاشی سرگرمیوں کے سلسلے میں نئے نئے طریقے وضع کیے جائیں۔

۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد امریکہ میں حب الوطنی اور قومی وحدت کے جو جذبات ابھرے ہیں ان کی مدد سے امریکہ کے معاشی مستقبل کا سامنا کیا جا سکے گا۔ اگرچہ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے بہتر سالوں کے مقابلے میں یہ زیادہ مشکلات کا حامل ہے اور زیادہ بے یقینی کی کیفیت رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آخر کار ان کارروائیوں کے نتیجے میں زیادہ ذرائع کا حامل اور مستحکم کاروباری نظام جنم لے جو دم بدم بدلتے ہوئے عالمی حالات میں زیادہ موثر طریقے سے چل سکے۔

[مَرے ویڈنبام واشنگٹن یونیورسٹی، سینٹ لوئیس، میسوری میں پروفیسر ہیں۔]

15 — 20-2-04

S.P. Sharma

معیاری کتب کے قارئین کے

دینی مدارس

کیفیت، مسا

مرتبہ: سلیم منصور خالد

دینی تعلیم کے ساتھ معاصر مسلم معاشرے کا رویہ اور دینی

کے چیلنجوں کا معروضی جائزہ

صفحات 472

خاندانی منص

طاقت، سیاست اور

مصنف: الزبتھ لیاگن

آبادی سے متعلق حالیہ رجحانات، آبادی پر کنٹرول کے منصوبہ

عالمی پروگرامات پر امریکی مصنفہ کی عرق ریز تحقیق کا حاصل

219 صفحات

Fax: 2650704

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، نصر چیمبرز، بلاک

1211(09 ora 230/21 .

اسٹڈیز

کے لیے آئی پی ایس کی نئی کتب

ں میں تعلیم

کل، امکانات

دارس پر اعتراضات اور تاریخی و تہذیبی پس منظر میں مستقبل

قیمت 300 روپے

صوبہ بندی

مفادات کا عالمی کھیل

مترجم: صاحبزادہ محب الحق

جات اور ان کا پس منظر اور عالمی عزائم، خاندانی منصوبہ بندی کے

قیمت 150 روپے

E-mail: ips@ips.net.pk

19، مرکز F-7، اسلام آباد فون: 2657971-3